بسم اللہ الرحمن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۵۹ | ۲۵ر اگست ۲۰۲۲ء مطابق ۲۶ر محرم الحرام ۱۴۴۴ھ | شمارہ نمبر ۲۰

اس شمارے میں

شعروادب ہم سے ہے عظمت ملک کی.....	مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ	۴
اداریہ 'تعمیر حیات' کو صدمہ	شمس الحق ندوی	۵
تجدید دین عالم اسلام کی سب سے بڑی ضرورت	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	۷
فلاح دارین توحید کی حقیقت اور انسان کی عزت	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۱۱
فکر ونظر قوموں کی ترقی کا راز	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی	۱۶
حادثۂ فاجعہ مولانا محمود حسنی۔ کچھ یادیں، کچھ باتیں	مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی	۱۸
راہِ عمل دعاۃ ومفکرین کی ذمہ داری	مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی	۲۱
محاسن اسلام زبان کا بہتر استعمال اور ہمارا سماج	مولانا سراج الدین ندوی	۲۲
صحبتے با اہل دل دلوں پر قرآنی آیات کے اثرات	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۲۴
تاریخ ہند بی اماں۔ جن کو ہم نے بھلا دیا	نعیم الرحمن صدیقی ندوی	۲۵
علوم وفنون سائنس کے میدان میں مسلمانوں.....	عبید الرحمن ندوی	۲۸
حالات حاضرہ کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں	محمد فرمان ندوی	۳۱
فقہ وفتاویٰ سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۳۳

سرپرست

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT

A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)

IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157

State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ایم میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT

Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406

website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/400	فی شمارہ -/20	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے 75$

ڈرافٹ نمبر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30₹ جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر اطہر حسین نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر وادب

ہم سے ہے عظمت ملک کی، ہم سے ہے ملت کا بھرم

مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ

ہم ہیں وطن کے پاسباں ، ملت کے ہیں ہم ترجماں
ہم ہیں چمن کے باغباں ، بادِ صبا، عنبر فشاں
ہم دینِ حق کے کارواں ، علم و عمل کے کہکشاں
ہم نازشِ ہندوستاں ، ہم نازشِ ہندوستاں
ہم بوئے گلہائے چمن ، ہم مہرِ تاباں کی کرن مسلم ہیں ہم، ہم سے وطن، ہم سے وطن کا بانکپن

بے باک ہم ، خوددار ہم ، حق کے علمبردار ہم
کچلے ہوئے طبقوں کے ہیں ہمدرد ہم ، غم خوار ہم
کرتے ہیں ظلم و جور کے آتش کدے گلزار ہم
کرتے ہیں بے خوف و خطر حق بات کا اظہار ہم
ہم بوئے گلہائے چمن ، ہم مہرِ تاباں کی کرن مسلم ہیں ہم، ہم سے وطن، ہم سے وطن کا بانکپن

کمزور کے دمساز ہیں ، لاچار کے ہمراز ہیں
شاہین ہیں ، شہباز ہیں ، ہم مائلِ پرواز ہیں
ہم قوم کی آواز ہیں ، ملک و وطن کا ساز ہیں
ملت کا ہم اعزاز ہیں ، سرمایۂ صد ناز ہیں
ہم بوئے گلہائے چمن ، ہم مہرِ تاباں کی کرن مسلم ہیں ہم، ہم سے وطن، ہم سے وطن کا بانکپن

بخشا ہمیں اللہ نے سوزِ عرب ، سازِ عجم
لیتے ہیں نام اللہ کا ہم کو بہ کو ، ہم یم بہ یم
ہم سے ہے عظمت ملک کی ، ہم سے ہے ملت کا بھرم
ہم برگِ گل ، رنگِ چمن ، نورِ سحر ، ابرِ کرم
ہم بوئے گلہائے چمن ، ہم مہرِ تاباں کی کرن مسلم ہیں ہم، ہم سے وطن، ہم سے وطن کا بانکپن

☆☆☆☆☆

ادارِیہ

’تعمیر حیات‘ کو صدمہ إنا للہ وإنا الیہ راجعون

شمس الحق ندوی

ماہِ اگست کی ۱۲؍تاریخ مطابق ۱۳؍ماہ محرم بروز جمعہ تقریباً صبح کے نو بجے ہوں گے کہ محمود میاں، جو کہ تعمیر حیات کی ادارت میں ہماری نیابت بھی کرتے تھے، ہم لوگوں کے درمیان نہیں رہے، اور خالقِ حقیقی رب العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہوگئے، انا للّٰہ و انا الیہ راجعون، ان للّٰہ ما أعطی و له ما أخذ، و کل شئ عنده بأجل مسمی۔

اس سے قبل انھوں نے علالت کا اک طویل عرصہ صاحبِ فراش رہ کر گذارا، مختلف معالجین نے ان کا علاج کیا، اور وہ علاج کی خاطر وجے واڑہ و چنڈی گڑھ بھی گئے؛ لیکن ہوتا وہی ہے جو کاتبِ تقدیر نے قرطاسِ لوح پر تخلیقِ کائنات سے بھی ہزاروں سال قبل تحریر کردیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طے کی ہوئی مدتِ حیات یا اجل سے کوئی نفس نہ ایک لمحہ آگے بڑھ سکا اور نہ پیچھے رہ سکا ہے: ”فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُم لَايَستَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَستَقدِمُوْنَ“ [اعراف:۳۴]۔

محمود میاں کی وفات کا سانحہ ایک بڑا خسارہ ہے؛ وہ اپنی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر اپنے بڑوں کے نزدیک ایک مخصوص اور ممتاز مقام بنا چکے تھے، اور کوئی مضائقہ نہیں اگر کہا جائے کہ وہ ان کے نزدیک اہم ہو چکے تھے، اور ان سے مستقبل میں بڑی امیدیں بھی قائم ہوتی جارہی تھیں۔

مادی نگاہوں سے دیکھا جائے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی جو وہ رخصت ہوگئے؛ وہ ہمارے سامنے ہی تو پلے بڑھے، اور ہمارے چھوٹوں سے بھی عمر میں چھوٹے تھے، گرچہ اپنی ہونہاری اور تیز گامی سے بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کررہے تھے، بڑی حد تک خود کو منوا چکے تھے، اور ایک ابھرتی ہوئی شخصیت کے طور پر ہم سب کے سامنے تھے۔

محمود میاں بچپن ہی سے بڑے شریف النفس، متواضع مزاج، صاحبِ ورع وتقوی اور صالح و باکردار تھے۔ بالفاظِ دِگر ان کی نشو ونما ایسے ہی ہوئی تھی جیسے خانوادۂ حسنی کے ممتاز افراد کی ہوا کرتی ہے؛ نوعمری میں بھی کھیل کود سے کوسوں دور، اعمال واذکار اور درس ومطالعہ کے شوقین رہے، جس کی بنا پر کم عمری ہی میں اہلِ علم وعمل کے طبقہ میں اچھا مقام وحیثیت ان کو حاصل ہوگیا تھا۔

محمود میاں کی تعلیم وتربیت اور ساخت وپرداخت میں مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم المرتبت شخصیت کا بھی بڑا حصہ رہا اور ان کو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی حیات کا کافی عرصہ صحبت ومعیت کے لیے میسر آیا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد انھوں نے خود کو موجودہ ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ اور سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گویا حوالہ کردیا، اور ان کی تربیت وتوجہ ان کو حاصل رہی، اور آخر کے کئی سال انھوں مدرسہ ضیاء العلوم میں تدریسی خدمت کو بھی ترک کر کے خود کو حضرت مولانا مدظلہ کی خدمت اور علمی معاونت کے لیے وقف کردیا، اور آخر کار ان کے علمی وتصنیفی معاون اور مزاج شناس بنے، جس سے حضرت ناظم صاحب مدظلہ کو پیرانہ سالی میں بڑی راحت رہی۔ یہ

حضرات اور اسی طرح سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا عبداللہ عباس ندوی مرحوم کی بھی خصوصی شفقت ومحبت انہیں حاصل رہی، اور ان سب کے زیرِ سایہ رہ کر جہاں وہ بلند اخلاق وکردار کے حامل بنے، وہیں ایک اچھے قلم کار اور مصنف بھی بنے، اور ان کے اسلوب نگارش میں اپنے بڑوں کے اسلوب تحریر کا رنگ نمایاں طور پر ظاہر ہوا، خاص طور پر انھوں نے سوانح نگاری اور تاریخ نگاری کو تحریر وتحقیق کا میدان بنایا، ان کی کئی تحریریں اس سلسلہ میں سامنے آئیں، اور اہلِ ذوق ونظر نے ان کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ ناانصافی ہوگی اگر یہاں اس بات کا ذکر نہ کیا جائے کہ ان کے نانا مولانا سید محمد ثانی حسنی ندوی رحمہ اللہ بھی ایک کامیاب اور بلند معیار کے سوانح نگار رہے تھے، یوں گویا فنِ سوانح نگاری کا ایک حصہ محمود میاں کو اپنے نانا محترم بھی سے وراثت میں ملا تھا۔

پندرہ روزہ 'تعمیر حیات' سے باضابطہ تعلق سے قبل وہ دارِعرفات، رائے بریلی میں تصنیف وتحقیق میں درک حاصل کرنے کی غرض سے وابستہ ہوئے، اور ۲۰۰۱ء سے 'تعمیر حیات' میں نائب مدیر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا، اور وہ اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی تادمِ واپسیں ادا کرتے رہے۔

تعمیر حیات کی مجلسِ ادارت کو ان سے بڑی تقویت اور تعاون حاصل تھا۔ ان کو اس دینی، علمی واصلاحی مجلّہ سے قلبی لگاؤ تھا، اور وہ اس کو ندوہ کے مزاج ومذاق اور معیار پر برقرار رکھنے کا اچھا ذوق وجذبہ رکھتے تھے، اور پوری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ خاص طور پر 'تعمیر حیات' کی قدیم فائلوں پر ان کی بڑی نظر تھی؛ اس کے قدیم وجدید قلم کاروں سے وہ بڑی واقفیت رکھتے تھے، اور ندوہ کی تاریخ کے بھی وہ بڑے رمز شناس تھے، اور قدیم وجدید شخصیات کے احوال وکارناموں سے ان کو بڑی واقفیت تھی، علوم شرعیہ دینیہ اور اسلامی تحریکات، ادارے اور شخصیات کا تاریخی علم اس پر مستزاد۔ اور ان کی یہ معلومات مجلّہ کے حق میں ہمیشہ مفید اور کارگر ثابت ہوتی تھیں۔ انھوں نے اس عرصہ میں تعمیرِ حیات کے جو خصوصی شمارے نکلے، جن میں مولانا علی میاں نمبر، مولانا عبداللہ عباس نمبر، مولانا مفتی محمد ظہور ندوی نمبر، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نمبر اور آخر میں مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی اور پروفیسر اطہر حسین خالدی پر مشترکہ نمبر کی تیاری میں اپنے علم وصلاحیت سے بڑا فائدہ پہونچایا۔

محمود حسنی' ان صفات وصلاحیتوں کی وجہ سے اپنے بڑوں کے منظورِ نظر رہے، ندوہ میں بھی ہر خورد وکلاں ان سے تعلق رکھتا تھا، اور ندوہ کے متعلقین میں بھی وہ متعارف ومحبوب تھے۔ جہاں تک خود ان کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنے روابط وتعلقات سے ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا؛ بلکہ دینی اداروں اور بالخصوص ندوۃ العلماء کو فائدہ پہونچانے کی کوشش کی۔ اور یہ ان کی وہی روش تھی' جو انھوں نے اسلافِ خاندان اور خاندان کے موجودہ اکابر سے پائی تھی، اور جو ان کے خانوادۂ حسنی کی جملہ خوبیوں اور امتیازات میں شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ چین نصیب فرمائے، عرصہ تک نگاہیں محمود میاں کو چار دانگِ ندوہ میں تلاش کرتی رہیں گی، جہاں کبھی وہ کتب خانہ شبلی نعمانی، تو کبھی مجلس تحقیقات ونشریات، تو کبھی دفتر تعمیرِ حیات یا مجلس صحافت وغیرہ کی طرف آتے جاتے مستقل نظر آتے تھے کہ یہی علمی وتحقیقی شعبے ان کی تفریح گاہیں تھیں، اور اسی نوعیت کے مشاغل ان کا اوڑھنا بچھونا تھے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، سیئات کو حسنات سے مبدل فرمائے، درجات بلند فرمائے، 'تعمیر حیات' کو بالخصوص ان کا نعم البدل عطا فرمائے، اور ان کے اعزہ ومتعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

تجدید دین

عالم اسلام کی سب سے بڑی ضرورت

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اس دین کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر اور مقدر کردیا ہے کہ اس کے لیے زندہ اشخاص برابر پیدا ہوتے رہیں گے، کوئی درخت اس وقت تک سرسبز وشاداب اور زندہ درخت نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ وہ باثمر نہ ہو، اس میں نئی نئی پتیاں اور نئے نئے شگوفے نہ کھلتے رہتے ہوں، یہ دین زندہ ہے اور زندہ انسانوں کے لیے ہے، اور اس کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے، وہ دین مٹ گئے، ختم ہوگئے، جنھوں نے روحانیت کے میدان میں، علم کے میدان میں، فکر کے میدان میں، قیادت کے میدان میں زندہ اشخاص پیدا کرنے بند کردیے، انسان زندہ اشخاص سے متاثر ہوتا ہے، چراغ سے چراغ جلتا رہا ہے اور چراغ سے چراغ جلنا چاہیے اور جلتے رہنا چاہیے، اور اگر اس امت کو باقی رہنا ہے تو اس امت کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندہ اشخاص پیدا کرے، اس کا درختِ علم، اس کا درختِ فکر، اس کا درختِ اصلاح اور اس کا درختِ روحانیت نئے نئے برگ وبار لاتا رہے، نئے نئے شگوفے کھلاتا رہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ میری امت بارانِ رحمت کی طرح ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے ابتدائی قطرے مردہ زمین کے لیے زیادہ حیات بخش ہیں یا بعد کے۔

میں تاریخ لکھتا رہا ہوں، میرے شعور اور تصنیف وتالیف کی عمر زیادہ تر اسی کوچہ میں گزری اور میں کہہ سکتا ہوں:

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

میں اب بھی اس پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ اسلاف کے کارنامے، اسلاف کا خلوص و صداقت، اسلاف کا تعلق مع اللہ، اسلاف کی استقامت اور اسلاف کی قربانیاں بعد کی نسلوں کے لیے بہترین سرمایہ ہیں اور وہ حیات وزندگی کا پیغام دینے والی ہیں، ہم نے ہمیشہ کہا اور مانا کہ ہمارے بزرگ ایسے تھے، ان کا حافظہ اتنا قوی تھا، ان کا علم اتنا وسیع تھا، وہ ایسے متبحر عالم تھے، یہ سب سر آنکھوں پر لیکن اتنا کافی نہیں۔

جس ادارہ اور مکتبِ خیال سے میرا تعلق ہے، اس نے تاریخ اسلام کو مرتب کیا، اس تحتی براعظم (ہند) میں جس ادارہ نے اردو میں تاریخ اسلام مرتب کرنے کی سب سے پہلے سعادت حاصل کی ہے، اس سے میرا تعلق ہے، یعنی ”دارالعلوم ندوۃ العلماء“ اور ”دارالمصنّفین“، کسی اور کی زبان سے تو شاید آپ سوچیں کہ یہ تاریخ سے ناواقف ہے، اور تاریخ سے انصاف نہیں کرتا، میری زبان سے سنیے کہ اسلاف نے جو کچھ کیا، اس کو محفوظ رہنا چاہیے، اور اسی آب و تاب کے ساتھ رہنا چاہیے، اور نئی نسلوں کو اس سے روشناس کرانا چاہیے، اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر اسلاف کے کارنامے جمع کرنے چاہئیں، لیکن اس دین کے لیے خدا فیصلہ کرچکا ہے کہ یہ دین قیامت تک کے لیے ہے، لہٰذا اس کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے، روحانیت بھی زندہ انسانوں ہی سے قائم ہے، محققین صوفیاء کی اور مشائخ کی تحقیق بھی یہی ہے کہ تزکیہ وعلم باطن بھی زندہ انسانوں ہی سے حاصل کیا جاتا ہے، اور زندہ انسانوں ہی سے اس کی تکمیل ہوتی ہے، ورنہ ایسے ایسے بلند مرتبہ لوگ گزرے ہیں کہ ان میں سے ایک کافی تھا، لیکن وہ کہتے ہیں کہ زندگی میں حرکت ونمو ہے، زندگی میں تنوع ہے، ابھی ایک رنگ آیا ایک رنگ گیا، ابھی ایک مرض پیدا ہوا اور ایک مرض گیا، اس لیے جن کا تعلق اس زندہ کائنات اور عالمِ طبیعی سے ٹوٹ چکا ہے، وہ ان متحرک اور زندہ انسانوں کی رہنمائی نہیں کرسکتے، فیض ان سے حاصل ہوسکتا ہے (فیض کے جو طریقے ہیں ان کے ذریعہ) اس میں غلط فہمی نہ ہو، لیکن رہنمائی زندہ انسانوں ہی سے حاصل ہوتی ہے، کسی نسل میں سب کچھ ہے، بڑے بڑے کتب خانے ہیں، تاریخ کے بڑے بڑے ذخیرے ہیں، لیکن زندہ ہستیاں نہیں ہیں، جن کے قلوب سے اور جن کے اجتہادِ فکر سے، جن کے تفقہ سے، جن کی بصیرت سے ہم روشنی حاصل کریں، اس نسل کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

حدیث صحیح میں ہے کہ: ”إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلَى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا“ [أبوداود: ۴۲۹۱] سنن کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر سو برس میں ایک مجدد بھیجتا رہے گا، جو اس دین کو تازہ کردے گا، اور تجدید کا فرض انجام دے گا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت تو وہ دین کو تازہ کردے گا، پھر وہ سلسلہ ختم ہوجائے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عرصہ تک اس کا وجود رہے گا، ”مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا“ کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آئے اور ہفتہ دو ہفتہ کے لیے دین کا چرچا ہوگیا اور چلے گئے، ان میں سے کسی بھی بزرگ کا حال پڑھیں، کسی کا اثر سو برس تک رہا اور بعض ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کا اثر صدیوں تک رہا۔

ریلوے لائن پر ایک چھوٹی گاڑی چلا کرتی

تھی، (اور غالباً اب بھی چلتی ہے) جس کو ٹرالی کہتے تھے، لوگ اس کو ٹھیلتے تھے، اور پھر اس پر بیٹھ جاتے تھے، اور وہ چلتی اور پھسلتی رہتی تھی، جب وہ رکنے لگتی تھی تو پھر اتر کر دھکا دیتے تھے، اور بیٹھ جاتے تھے، اس سے لائن کا معائنہ ہوتا تھا، اس امت کی گاڑی کو بھی اسی طرح سمجھیے اور اس کو ٹھیلنے والے اس امت کے علماء اور مشائخ اور مجدد ہیں، یہ اس کو ٹھیل دیتے ہیں، اور وہ خود اپنے پہیوں پر چلتی ہے، یہ نہیں کہ اس کو چلاتے ہی رہتے ہیں، گاڑی خود چلے گی اپنے پہیوں پر، لیکن اس کو ٹھیلنے اور چلانے کے لیے زندہ انسانوں کی ضرورت ہے، وہ کوئی ٹیکنکل چیز نہیں، زندہ انسان اس کو بڑھاتے ہیں اور ٹھیلتے ہیں، اور وہ اپنے پہیوں پر چلتی ہے، کیونکہ ٹرالی کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے، پٹریوں میں اتنی چکناہٹ اور پہیوں میں اتنی حرکت وسرعت اور چلنے کی اتنی صلاحیت ہو کہ وہ چل سکے، اور آدمیوں کے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہو کہ وہ اس کو ٹھیل سکیں، اور مسافر جو بیٹھے ہوں وہ ایسے ہوں کہ بیٹھے رہیں اور جم جائیں، اس امت کی روایت یہ ہے کہ جب اس پر تعطل اور بے عملی طاری ہونے لگتی ہے، تو کوئی اللہ کا بندہ آتا ہے اور اس کو دھکا لگاتا ہے، اور پھر وہ خود چلتی ہے، اور کچھ دور تک چلی جاتی ہے۔

میں مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ دونوں کو اس دور کا مجدد سمجھتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ جہاں کہیں بھی علم دین ہے، جہاں کہیں بھی سنت کی دعوت ہے، جہاں کہیں بھی شرک وبدعت سے اجتناب کا جذبہ اور اس سے تنفر ہے، یہ ان دونوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے، دیکھیے، ایک ایسا بھی انسان تھا جس نے اس زور سے دھکا دیا کہ امت کی گاڑی ساڑھے تین سو سال سے برابر چل رہی ہے، اور اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کتنا چلے، پھر کوئی اللہ کا بندہ پیدا ہو اور اس کے دھکے سے اور کتنا چلے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا پورا خاندان حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سوڈیڑھ سو برس کے بعد پیدا ہوا، اور ان کے کام کے اثرات تیرھویں صدی کے ابتداء میں ظاہر ہوئے، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ فریضہ ہے تمام مدارس کا اور تمام علماء کا کہ زندہ اشخاص پیدا کرتے رہیں۔

عالم اسلامی کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے علماء ملک میں رہیں کہ وہ نئے مسائل سمجھ سکیں، اور نئے مسائل کے حل پیش کرسکیں، اور اس میں وہ شریعت کی مدد سے، کتاب وسنت کی مدد سے، اصول فقہ اور فقہ کی مدد سے رہنمائی کرسکیں، اس لیے جہاں اور چیزوں کی ضرورت ہے، وہاں ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے متبحر علماء پیدا ہوں جیسے مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، اور دوسرے علماء جن کے نام اس وقت مجھے یاد نہیں آئے، پھر اس کے بعد میں نے کہا کہ زمانہ اتنا ترقی کرگیا ہے، اور اب زمانے کے فتنے اتنے سنگین اور زمانے کے چیلنج اتنے شدید ہیں کہ حقیقۃً ضرورت تھی امام غزالیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی، لیکن اگر حجۃ الاسلام غزالیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہؒ اس وقت نہ پیدا ہوں تو کم از کم اس درجہ کے لوگ پیدا ہوں جن کے نام میں نے لیے، لہٰذا مدارس کا یہ فرض ہے کہ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگادیں، کہ وہ تبحر پیدا ہو، وہ وسعت نظر اور عمق اور نظر کی گہرائی اور گیرائی پیدا ہو، اور وہ کتاب وسنت کی روح سے واقفیت پیدا ہو، مقاصد شریعت سے آگاہی پیدا ہو کہ بدلے ہوئے زمانہ میں امت کی رہنمائی کرسکیں، محض یہ کہ کتاب میں دیکھ لو، یہ کافی نہیں، اس لیے کہ کتابیں تو اپنے اپنے عہد میں لکھی گئی ہیں، اللہ نے صرف کتاب اللہ کی یہ خصوصیت قرار دی ہے کہ "لَاتَبْلَى جِدَّتُهُ وَلَا تَنْتَهِي عَجَائِبُهُ" کہ وہ کبھی پرانی نہیں ہوگی، باقی ہر انسانی کتاب میں اس عہد کی چھاپ ہوتی ہے، اس عہد کے گھنے سائے ہوتے ہیں، آپ کسی عالم کی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے، اگر اللہ نے آپ کو ذوق اور علمی بصیرت دی ہے تو آپ اسے دیکھ کر زمانے کا تعین کرسکتے ہیں کہ یہ کتاب فتنۂ تاتار سے پہلے لکھی گئی ہوگی یا فتنۂ تاتار کے بعد لکھی گئی ہوگی، یہ آٹھویں صدی کی تصنیف معلوم ہوتی ہے، ہر صدی کا اسلوب الگ ہوتا ہے، فکر اور علم کا طرز الگ ہوتا ہے، ان کے درجات الگ ہوتے ہیں، یہ مدارس بہت مبارک اور نہایت ضروری ہیں، ہم سب مدارس ہی کے خوانِ نعمت کے ریزہ چیں ہیں، اور میں جو آپ کے سامنے بیٹھا ہوا بات کہہ رہا ہوں، یہ مدارس ہی کا فیض ہے، اول سے آخر تک میری تعلیم اسی نہج پر ہوئی، لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں (اور خدا کرے کہ میری بات جتنی ہے اور جس درجہ کی ہے، اسی کے مطابق سمجھا جائے) کہ یہ دین زندہ ہے، اور زندہ انسانوں کی اس کو ضرورت ہے، اور زندہ انسانوں ہی کے دم سے یہ چلے گا، اسلاف کی عظمت میں رتی برابر کمی کرنا مقصود نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ اس پر قناعت نہیں کرنی ہے کہ اسلاف نے یہ کیا، کوئی مسئلہ پوچھنے آئے تو کہے کہ ہمارے یہاں ایک سے ایک بڑا عالم پیدا ہوا، آسمانِ علم، جبلِ علم، سائل کہتا ہے کہ کنویں میں فلاں جانور گرگیا ہے، تمام محلّہ والے پریشان ہیں، کتنے ڈول پانی نکالا جائے؟ آپ کہیں کہ ہمارے یہاں امام ابوحنیفہؒ پیدا ہوئے، امام زفرؒ پیدا ہوئے، اور آخر میں "بدائع الصنائع" کے مصنف، "البحر الرائق" کے مصنف اور "فتاوی عالمگیری" کے مصنف پیدا ہوئے، وہ کہے گا: حضرت! یہ سب صحیح ہے، لیکن جلدی بتایئے، نماز کا وقت بالکل قریب ہے، کہ اس کو کس طرح پاک کیا

جائے؟ کوئی آپ سے یہ پوچھنے آئے کہ ذرا سی یہ عبارت سمجھ میں نہیں آئی، یہ شعر سمجھ میں نہیں آیا، اس کے معنی بتائیے، آپ کہیں کہ ہمارے یہاں ایسے ایسے ادیب پیدا ہوئے جن کا جواب نہیں، عبدالقاہر جرجانی پیدا ہوئے، ابوعلی فارسی پیدا ہوئے، امام زمخشری پیدا ہوئے، حریری پیدا ہوئے، اور قاضی فاضل پیدا ہوئے، اور ہندوستان میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر ہوئے ہیں، وہ کہے گا: یہ سب ٹھیک ہے، لیکن میں کتاب پڑھانے جارہا ہوں، طالب علم منتظر ہیں، جلدی سے شعر کا مطلب بتائیے، اسی طرح ہر فن کا حال ہے، جس فن کا آدمی آیا تو کہہ دیا کہ ہمارے یہاں ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں، اس سے کام نہیں چلے گا۔

ہر ملک میں بلکہ ہر شہر میں ایسے متبحر آدمی ہونے چاہئیں جو وقت پر مدد کرسکیں، رہنمائی کرسکیں، یہ نہ کرسکیں، تو کم از کم کسی عالم کا حوالہ دے سکیں، میں خود یہ کرتا رہتا ہوں، کوئی اہم مسئلہ پوچھنے آتا ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ ہمارے مدرسہ میں مفتی موجود ہیں، ان سے پوچھو "لِکُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ" ہر فن کا شخص الگ الگ ہے، وہ فقہ پڑھاتے ہیں، علامہ ابن حزم کے متعلق امام ابن تیمیہؒ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انہوں نے "سعی" میں "رمل" و "اصطباغ" کو لکھ دیا ہے، وہ بہت ادب کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کو حج کرنے کا موقع نہیں ملا، تو ان کو طواف اور سعی میں التباس ہوگیا، یہ بات الگ ہے لیکن ہر چیز میں آپ اسلاف کے کارناموں کی فہرست گنانے لگیں کہ کیسے کیسے آدمی پیدا ہوئے، تو اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص پیاسا ہو اور پانی پینے آئے اور کہے کہ پانی پلا دیجیے، تو آپ اس سے کہیں کہ دنیا میں ایسی ایسی سبیلیں لگی ہیں اور ایسی ایسی آئس کریمیں ایجاد ہوئی ہیں، ایسے ایسے مشروبات ایجاد ہوئے ہیں، تو بھائی مشروبات کے نام لینے سے اور اس میں جو ترقیاں آپ کے اسلاف نے کیں، اس سے کیا ہوتا ہے، اس کو تو پانی چاہیے، چاہے آپ کٹورہ میں دیں یا مٹی کے کوزہ میں دیں، جب جا کر اس کی پیاس بجھے گی۔

علوم کا زوال بلکہ امتوں کا زوال اسی طرح ہوا کہ جب کوئی گیا تو کوئی دوسرا اس کی جگہ لینے والا نہیں، آج خطرہ اسی بات کا ہے، جو اٹھتا ہے جگہ خالی کر کے چلا جاتا ہے، خلا پر ہونا چاہیے اور اس کے لیے جانفشانیوں کی ضرورت ہے، یہ کام بغیر جانفشانیوں کے نہیں ہوسکتا، اگر آپ چاہتے ہیں کہ حدیث کا جید عالم پیدا ہو، فقہ کا کوئی جید عالم پیدا ہو تو اس کے لیے پِتّا پانی کرنے کی ضرورت ہے، اور افسوس ہے کہ اب ہمارے مدارس میں اس کا رواج نہیں رہا، سب کچھ ہے لیکن وہ محنت نہیں ہے، میں کہتا ہوں کہ مبالغہ نہ سہی، غلو نہ سہی مگر کسی درجہ میں انہماک ہونا چاہیے، یورپ میں جو ترقیاں ہوئی ہیں، اسی لائن سے ان میں بھی استغراق ہے، میں نے واقعات سنے ہیں کہ بعض تحقیقی کام کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہوئی کہ کب صبح ہوئی اور کب شام ہوئی، میرے جاننے والے ایک دوست جرمنی گئے تھے، انہوں نے کہا: ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ کب کام شروع کرتے ہیں؟ آپ کا یہ ادارہ کب سے کھلتا ہے؟ تو اس نے کہا: ابھی بتاتا ہوں، وہ اندر گیا اور ایک آدمی سے پوچھا کہ میرا شعبہ کب سے کھلتا ہے؟ اس نے بتایا اتنے بجے، تو آکر کہہ دیا کہ اتنے بجے سے، میں نے کہا کہ کیوں آپ نے خود کیوں نہیں بتلایا؟ تو اس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں، میں اتنی صبح آجاتا ہوں کہ مجھے ہوش نہیں رہتا اور میں گھڑی بھی نہیں دیکھتا، کام کا جوش اتنا غالب ہوتا ہے۔

یہ انتشار کا دور ہے، آج کل تو بڑی مصیبت یہ ہے کہ آپ یہاں سے جائیے، پچاس چیزیں آپ کو ایسی نظر آئیں گی جو انتشار پیدا کرنے والی ہوں گی، آپ ایسے حالات دیکھیں گے جو انتشار پیدا کرنے والے ہوں گے، آپ ایسی تصویریں دیکھیں گے جو ساری ذہنی یکسوئی ختم کر دیں گی، اور اگر ٹیلی ویژن ہو رہا ہے، تو سبحان اللہ یا اناللہ کہہ دیجیے، اُس زمانہ کی خوبی یہ تھی کہ انتشار پیدا کرنے والی چیزیں کم تھیں، اور لوگوں میں علمی استغراق تھا، میرے ایک مغربی استاد نے بتایا کہ ایک صاحب مغرب (مراکش) میں فقہ مالکی پر کتاب لکھ رہے تھے، ان کا روزانہ کا یہ معمول تھا کہ دوپہر کو وہ گھر جاتے تھے، اور کھانا کھاتے تھے، اور آجاتے تھے، ایک دن وہ گھر نہیں گئے تو لوگوں نے کہا کہ آج آپ کھانے پر تشریف نہیں لائے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، میں تو آیا تھا، میں نے کھانا بھی کھایا! اب ان کو فکر ہوئی کہ کیا بات ہوئی، معلوم ہوا کہ مسئلہ سوچتے ہوئے نکلے اور ایک گھر کا دروازہ کھلا تھا، اس میں چلے گئے اور وہ لوگ اتنے مثقف اور مہذب تھے کہ انہوں نے کھانا کھلایا اور ان کو بالکل محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کا گھر نہیں ہے، اس زمانے میں علماء کی قدر تھی، ان کو شاید معلوم تھا کہ وہ اس وقت نکلتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں، گھر والوں نے دسترخوان بچھایا، ہاتھ دھلائے، انہوں نے کھانا کھایا، ہاتھ پونچھے اور اپنی جگہ آگئے، اور یہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنے گھر گئے تھے اور کھانا کھایا تھا۔

ایک واقعہ امام غزالیؒ نے غالباً "احیاء العلوم" میں لکھا ہے، کہ امام شافعیؒ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبلؒ کے گھر آئے، امام صاحب کے بچے کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے تھے کہ ہمارے والد ہر نماز کے بعد امام شافعیؒ کے لیے دعا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ "اے اللہ! محمد بن ادریس کو زندہ رکھ، قائم رکھ، ان کی عمر میں برکت دے" وہ بچے سوچتے تھے کہ ہمارے باپ امام وقت ہیں، ان کے استاد کیسے

ہوں گے جن کے لیے یہ دعا کرتے ہیں؟ تو ایک مرتبہ پوچھا کہ اباجان! آپ کس کے لیے دعا کرتے ہیں اور کیوں؟ انہوں نے کہا: "یَا بُنَيَّ! إِنَّهُ کَالشَّمْسِ لِلدُّنْيَا وَالْعَافِيَةِ لِلْبَدَنِ" ایک مرتبہ لطیفہ یہ پیش آیا کہ امام شافعیؒ تشریف لے آئے، تو گھر والوں نے سمجھا کہ گھر بیٹھے دولت ملی، بڑی خاطر مدارات کی اور رات کو جب وہ کھانا کھا کے اور باتیں کر کے بستر پر لیٹے، تو بچوں نے سوچا کہ والد صاحب بڑا وقت عبادت میں گزارتے ہیں، یہ تو ہمارے والد کے بھی استاد ہیں، ان کی تو پلک بھی نہیں لگے گی، رات بھر عبادت کریں گے، چنانچہ انہوں نے لوٹا بھر کر رکھ دیا کہ رات کو اٹھیں گے، وضو کریں گے، عبادت میں مشغول ہو جائیں گے، لیکن وہ صبح تک سوتے رہے، یہاں تک کہ امام احمد بن حنبلؒ آئے اور انہوں نے اٹھایا، وہ اٹھے اور بے وضو کیے ہی نماز پڑھنے چلے گئے، اب تو ان کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ یا اللہ! قصہ کیا ہے؟ لوٹا دیکھا تو ویسا کا ویسا بھرا رکھا ہے، بڑی حیرت کہ انہوں نے بے وضو نماز پڑھی، اس زمانے میں اعتراض کرنے کا رواج نہیں تھا، جب وہ مجلس میں آکر بیٹھے تو امام احمد بن حنبل سے امام شافعیؒ نے کہا کہ ابو عبداللہ! رات کو عجیب واقعہ پیش آیا، جب تم مجھے لٹا کر گئے تو فلاں حدیث کی طرف ذہن چلا گیا، میں نے اس سے مسائل استنباط کرنے شروع کیے، رات بھر مسائل استنباط کرتا رہا، مسائل کی ایک بڑی تعداد بیان کر کے فرمایا کہ اتنے مسائل استنباط کر چکا تھا کہ صبح ہو گئی، اسی لیے شاعر نے کہا ہے:

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

اللہ تعالیٰ ہمارے اس خلا کو پُر فرمائے۔

☆☆☆☆☆

علم دین ذریعۂ معیشت نہیں

مولانا ابوالکلام آزادؒ

طلبائے عزیز! کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ تم جو تعلیم حاصل کر رہے ہو، اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ علم مقصود ہے یا وسیلہ؟ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ وسیلہ ہیں، اصل مطلوب نہیں، البتہ مطلوب ہیں وہ ان کے بغیر نہیں مل سکتیں، اس لیے وسیلہ بھی مطلوب ہو جائے گا، جو چیزیں مقاصد میں داخل ہیں، ان میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، بھوک میں غذا مقصد ہے، وسیلہ اس کو بدل نہیں سکتا۔

تم نے اپنے گھروں اور عزیز واقارب کو چھوڑا اور یہاں آئے، ملک میں تعلیم کے دوسرے طریقے بھی رائج ہیں، لوگ ان کی طرف دوڑتے ہیں مگر تم نے اسکولوں اور کالجوں سے آنکھیں بند کیں تاکہ دینی علوم میں مہارت حاصل کرو، بڑا مبارک ارادہ ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جس علم کو تم سیکھ رہے ہو وہ علم وسیلہ ہے یا مقصد؟ تمہارے ذہن نے اگر اس کو نہ سمجھا تو میں متنبہ کروں گا کہ تم صحیح کام نہیں کر رہے ہو، اور قوموں نے ہمیشہ علم کو وسیلہ سمجھا ہے مگر مسلمانوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انھوں نے علم کو وسیلہ نہیں مقصد سمجھا، ذریعہ معاش نہیں سمجھا۔ ہندوستان میں ۲۴ / یونیورسٹیاں ہیں، کالج ہیں اور لاکھوں اسکول ہیں، جن کا دامن دیہات تک پھیلا ہوا ہے، ان میں جو تعلیم ہوتی ہے، اس کو وسیلہ سمجھا جاتا ہے مقصد نہیں سمجھا جاتا، ان میں صرف اس لیے تعلیم حاصل کی جاتی ہے کہ سرکاری ملازمتیں مل سکیں اور اونچے عہدے حاصل کیے جاسکیں جو شخص وہاں جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جب تک یہاں کی ڈگری موجود نہ ہو وہ معاش حاصل نہیں کر سکتا، مگر میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جس علم کی خاطر تم زانوئے ادب تہہ کر رہے ہو وہ علم مقصد ہے؟ وسیلہ نہیں ہے؟ اس کو کسی وسیلہ کے لیے حاصل نہیں کیا جاتا، بلکہ اس لیے حاصل کیا جاتا ہے کہ اس کا حصول فرض ہے، مسلمانوں نے ہمیشہ علم کو علم کے لیے سیکھا ہے، وسیلہ کے لیے نہیں، انھوں نے کبھی علم کو اس لیے حاصل نہیں کیا کہ اس کے ذریعہ معیشت حاصل کریں، مسلمانوں نے ذریعہ معیشت کسی اور چیز کو بنایا، جنھوں نے علم کے افسانے سنے ہیں وہ جانتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ جنھوں نے علم و فقہ مدون کیا، جس پر کروڑوں مسلمان عمل کرتے ہیں وہ پارچہ فروش تھے انھوں نے اپنے وسیع علم کو ذریعہ معیشت نہیں بنایا، معروف کرخیؒ موچی تھے، آج ہم اِس پیشہ کو سننے کو بھی تیار نہیں ہیں، وہ کرخ میں نکل جاتے، بازار میں بیٹھتے، راہ چلتے آدمیوں کے جوتے سیتے اور اس کی اجرت سے گزر بسر کرتے، شمس الائمہ کا نام ہی حلوائی پڑ گیا تھا اور اتنا بڑا عالم اپنا ذریعہ معیشت حلوہ فروشی بنائے ہوئے تھے۔

اسی طرح اسلام کے مشہور علماء نے علم دین کے چشمے بہائے مگر کبھی علم دین کو ذریعہ معیشت نہیں بنایا، وہ علم کو علم کے لیے حاصل کرتے تھے، زخارف دنیوی کے لیے نہیں، ان کے نزدیک یہ گناہ تھا کہ علم کو دنیا کے لیے حاصل کیا جائے، وہ تشنگان علم کو علم کی روشنی سے سیراب کرنا ہی اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے، یہ ہمارے علماء کا خاص شیوہ رہا ہے کہ دین کی خدمت، علوم دینیہ کی اشاعت کو انھوں نے اپنا فریضہ سمجھا ہے، انھوں نے اس کے لیے خرید و فروخت کا بازار گرم نہیں کیا، اس حقیقت کو اگر تم نے سمجھ لیا تو اپنی زندگی کی تاریخ ڈھال لی۔

☆☆☆

فلاح دارین

توحید کی حقیقت اور انسان کی عزت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

سورۂ حج کے آغاز میں توحید اور شرک کی نفی سے بات شروع ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے شرک نہ ہونے کی سب سے زیادہ اہمیت بیان کی ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اس نے ایک کائنات پیدا کی، جس کو وہ عدم سے وجود میں لایا اور پھر اس کا نظام بنایا، اور وہ نظام پہلے سے طے کردیا، اور ایسا طے کیا کہ اس میں باریک سے باریک بات بھی طے کردی، مثلاً: ایک چیونٹی جو کسی جگہ چل رہی ہے وہ بھی اللہ نے پہلے سے طے کردیا تھا کہ یہ چیونٹی فلاں دن فلاں وقت فلاں جگہ چلے گی اور اس طرح چلے گی، اسی طرح خون جو انسان کے جسم میں گردش کررہا ہے، وہ پہلے سے اللہ نے طے کردیا تھا کہ یہ یوں گردش کرے گا، ہر چیز پہلے سے اللہ تعالیٰ کے یہاں طے ہے، گویا جس طرح دنیا میں کوئی پروگرام بنایا جاتا ہے وہ بنالیا گیا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ انسان کو اگر کوئی عمارت بنانی ہوتی ہے تو وہ پہلے اس کا پورا نقشہ بناتا ہے کہ اتنی اونچی دیواریں ہوں گی، اتنے کمرے ہوں گے، یہ راستے ہوں گے اور یہ گیلری ہوگی، اور اس کے بعد وہ نقشہ کام کرنے والوں کو دیا جائے گا کہ وہ اس طرح کام کریں اور پھر اس کا کوئی نگراں ہوگا، ایک انجینئر ہوگا جو یہ دیکھے گا کہ کام ٹھیک ہورہا ہے یا نہیں، اور وہ اس کو پوری طرح کنٹرول کرے گا، اسی طرح کائنات کے نظام میں بھی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے خود طے کی ہیں، اس کی ذات بہت بڑی ہے، ہماری ایک کمی یہ ہے کہ ہم چیزوں کو اپنے حساب سے سوچتے ہیں، اور ہمارا دائرہ بہت محدود ہے، عقل اور کار دونوں ہی کا دائرہ بہت محدود ہے، ہم کتنا کرسکتے ہیں؟ کیا کرسکتے ہیں؟ یہ بہت محدود ہے، مثلاً: جیسے ہمارا رہنا محدود ہے، ہم کہیں رہتے ہیں تو ایک خاص علاقہ میں رہتے ہیں، جب کہ اس کے علاوہ ساری دنیا پڑی ہے، لیکن ہم اس میں نہیں جاتے ہیں، اسی طرح انسان کی زندگی کا دائرہ بہت محدود ہے، اور اس کو جن چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ بھی محدود ہیں، وہ ہر چیز سے واقف نہیں ہے، اور نہ ہی ہر چیز سے اس کا واسطہ ہے۔

ہم انسان اس کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں اور ایک چھوٹی مخلوق ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے حقیر ترین چیز سے بنایا ہے، یہ پوری کائنات جس میں سات آسمان ہیں، سات زمینیں ہیں، اس میں زمین بہت حقیر ہے اور آسمان، بہت بڑی چیز ہے، اور اس سے متعلق چیزوں کی عظمت، ان کا وقار بھی بہت زیادہ ہے اور ان کی پاکیزگی بھی بہت زیادہ ہے، لیکن زمین حقیر ہے، زمین میں سنڈاس بھی ہے، گوبر و پاخانہ بھی ہے، گویا زمین ان چیزوں سے بنی ہے، لہٰذا آسمان کے مقابلہ میں زمین بہت حقیر وذلیل ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت کا اظہار فرمایا کہ انسان کو زمین یعنی مٹی سے بنایا، گویا ایک حقیر ترین چیز سے انسان کو بنایا، اور پھر اس کو وہ رتبہ دے دیا کہ دوسری مخلوقات میں اس کو بڑا بنادیا، ظاہر ہے وہی سب کو پیدا کرنے والا ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے، لہٰذا اس نے حقیر چیز سے بنایا اور پھر اس کو دوسری مخلوقات سے حیثیت کے لحاظ سے اونچا کردیا، گویا دو چیزیں ہوگئیں: ایک حیثیت اور ایک اصلیت، انسان کی اصلیت بہت حقیر اور چھوٹی ہے مگر حیثیت بہت بڑی ہے، تاکہ انسان یہ نہ سمجھے کہ ہم کچھ ہیں، ظاہر ہے، ہم کچھ نہیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتا بھی ہے کہ ہم اس حقیقت کو سمجھیں کہ ہم کچھ نہیں ہیں، ہم ذلیل ترین اور پست ترین ہیں، لیکن اللہ کی شان کہ اس نے ہم کو عزت دے دی، یہ عزت ہم کو اللہ نے دی ہے، ہماری حیثیت اس عزت کی نہیں ہے، ہماری حقیقت یہ نہیں ہے، ہم اس دھوکہ میں نہ آئیں کہ ہم کچھ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو غیر معمولی عزت دی ہے، وہ خاص طور پر دو چیزوں سے دی ہے، ایک علم اور دوسرے عقل، انسان کے علاوہ جو مخلوقات ہیں جنوں کو چھوڑ کر ان کو کچھ معلوم نہیں ہے، گائے کو کچھ نہیں معلوم، بھینس اور پرندوں کو کچھ نہیں معلوم، بس وہ جہاں اڑ رہے ہیں اور جو دیکھ رہے ہیں ان کو اتنا ہی معلوم ہے، پھر اپنی معلومات سے وہ کوئی بڑا نتیجہ نہیں نکال سکتے، کوئی بڑا فیصلہ نہیں کرسکتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم کی صلاحیت دی، جس سے وہ معلومات حاصل کرسکتا ہے، جن چیزوں سے اس کو واسطہ پڑنا ہے، وہ ان کی معلومات حاصل کرسکتا ہے، پھر ان معلومات سے فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے، فائدہ اٹھانے کے لیے عقل اور معلومات اہم ذریعہ ہیں جن سے وہ فائدہ اٹھائے گا۔

اس سے پتہ چلا کہ ان دو چیزوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے گھومنے پھرنے کا اور اس کے کام کرنے کا رقبہ بہت بڑا بنادیا ہے، آپ جو کام کسی سے لیتے ہیں تو اس نے جتنا سیکھا ہے اسی کے لحاظ سے لیں گے، مثلاً: ایک گنوار آدمی ہے جس کی معلومات بہت کم ہیں، اس سے آپ بڑا کام نہیں لے سکتے، اور ایک شخص ہے جو بڑا عالم وفاضل ہوگیا ہے، بہت علوم سے واقف ہے، آپ اس سے اسی دائرہ کا بڑا کام

لیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو علم و عقل سے نوازا، وہ اس سے بڑا کام لینے کے لیے نوازا، جو دیگر مخلوقات سے وہ نہیں لے رہا ہے، اور اس کو کام کرنے کے لیے سارے وسائل بھی دے دیے، جن کے ذریعہ وہ کام لیتا ہے، کھانے پینے کے لیے اور آنے جانے کے لیے اور دوسری سہولتوں کے لیے جانور دیے، دنیا میں مختلف اقسام کے جانور ہیں، جن سے انسان ضرورتیں پوری کرتے ہیں، اسی طرح سورج اور چاند کو لگایا گیا، اور اللہ نے ان کی گردش کا ایسا نظام بنایا کہ جس سے انسان کو زندہ رہنے اور کام کرنے میں مدد ملے، سائنسداں بھی اس بات کو جانتے ہیں، سورج کا زمین سے جو فاصلہ ہے، اگر وہ زیادہ ہوجائے تو زمین میں اتنی ٹھنڈک ہوجائے گی کہ انسان زندہ نہیں رہ سکتا، اور اگر فاصلہ کم ہوجائے تو ہر چیز جل جائے گی، کیونکہ سورج کی گرمی بہت ہے، اسی طرح چاند کے لیے اللہ نے وہی حساب رکھا ہے، اور قرآن مجید میں ہے کہ ان سب کو ہم نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے، تمہارے لیے کام پر لگایا ہے، سارے جانوروں کو، ساری زمینی مخلوقات کو انسان کے تابع بنایا اور ان کی فطرت و مزاج ایسا بنایا کہ آپ گائے کو پکڑے لیے چلے جارہے ہیں، بکری کو پکڑے لے جارہے ہیں، اور وہ احتجاج بھی نہیں کررہی ہے، انکار بھی نہیں کررہی ہے، آپ نے بیل کو ہل سے لگادیا، اب بیل چل رہا ہے، اس کو کوئی احتجاج و انکار نہیں ہے کہ ہم کو کیوں جوت رہے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تمام چیزیں انسان کو دیں اور اعلیٰ رتبہ عطا فرمایا، لیکن انسان خود کیا ہے؟ وہ حقیر و ذلیل ہے اگر اپنی اصل کو دیکھے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ یہ یاد دلایا کہ تم پیدا کیسے ہوتے ہو؟ بہت حقیر و ذلیل چیز سے پیدا ہوتے ہو، تمہارا بیج بڑا گندا ہے، درخت کا بیج ہوتا ہے، جس سے درخت بنتا ہے، بیج ڈالتے ہیں، وہ زمین سے پھٹتا ہے تو درخت بنتا ہے، لیکن انسان کا بیج نہایت گندا ہے، وہ بیج گندگی سے بیج نکلتا ہے، اور اس سے صاف ستھرا پاکیزہ انسان نکلتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جسم میں پاکیزہ بننے کی صلاحیت بھی رکھی ہے، ورنہ اس کی گندگی ایسی نمایاں ہوتی کہ وہ اس کو دور ہی نہیں کرسکتا تھا، ظاہر ہے جب اس کی اصل کے اندر گندگی ہے تو وہ اس کو کیسے دور کرے گا، یوں بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ ہر انسان ظاہری طور پر خوب صاف ستھرا ہوتا ہے، لیکن اندر غلاظت موجود ہوتی ہے، جب وہ نکلتی ہے تو سب نہیں نکلتی، پیشاب پاخانہ سب اندر موجود رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارا جسم ایسا بنایا ہے کہ وہ گندگی اندر بند ہے، ہم وقفہ وقفہ سے اس کو نکال دیتے ہیں، تو ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم کتنے حقیر ہیں، اور اس کے باوجود ہم کو اللہ نے اتنا بڑا مقام دیا ہے، لیکن اس کے بعد بھی آدمی اللہ کو یاد نہ کرے، جس نے سب کچھ دیا، اس نے ہم کو یہ مقام دیا اور یہ کہا کہ اگر تم ہمارا شکر ادا کروگے، ہمارے احسان کو مانوگے تو ہم تم کو اور بہت اونچی جگہ دے دیں گے، ہم تم کو آسمان پر لے آئیں گے، گویا جو آسمان والا مقام ہے وہ تم کو مل جائے گا، اس وقت تم زمین کے مقام پر رہو، اسی میں تم کو یہ ساری عزت حاصل ہے، لیکن اس کے بعد تم کو کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، ہم تم کو بالکل صاف ستھرا کردیں گے، بعض مرتبہ دنیا میں دین دار لوگوں کے درمیان اختلاف ہوجاتا ہے، حالانکہ دین دار ہیں، اللہ والے ہیں، لیکن رائے کے لحاظ سے اختلاف ہوتا ہے، تو اس کے متعلق بھی فرمایا گیا کہ جنت میں جانے کے بعد اللہ تعالیٰ دلوں سے وہ کیفیت ہی نکال دے گا، یہ آپس میں تھوڑی بہت دین داروں میں بھی جو رنجش ہے، ان کو اللہ دین داری کا بدلہ دے گا، اور ان کی اندر کی وہ کیفیت نکال دے گا، تاکہ وہ بالکل صاف ستھرے ہوجائیں، لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب ہم شکر ادا کریں، فرمایا گیا ہے کہ اگر ایسا کروگے تو وہاں پہنچادیں گے، اور اگر نہیں کروگے تو گندی جگہ پر لوٹادیں گے، اور گندگی کا علاج کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے گندی چیز کو ختم کرنے کے لیے آگ رکھی ہے، یعنی آخرت کی آگ، لہٰذا جو شخص اپنی گندگی میں جتنا گندا ہوگا، اللہ کا نافرمان ہوگا، اس کی گندگی کو اسی حساب سے ختم کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو حقیر چیز سے بنانے کے بعد پاک کیا ہے، اور انسان نیکیوں سے پاک بنتا ہے، دین اسلام میں طہارت کے جو احکام ہیں کہ اپنے بدن کو اس طرح صاف رکھو، ان احکام کی وجہ سے ہم گندگی سے دور رہتے ہیں، اور جو لوگ اسلام کے ماننے والے نہیں ہیں، اگر آپ ان کے جسم کی حالت معلوم کریں تو وہ اندر سے نہایت گندے ہوتے ہیں، وہ بہت اچھا لباس پہنتے ہیں اور ظاہر بہت اچھا ہوتا ہے، لیکن وہ آبدست نہیں کرتے، اس لیے بہت برا حال ہے، اور پھر وہ گندگی کو گندگی نہیں سمجھتے، بس جس میں بو نہ آئے اور دیکھنے میں برا نہ معلوم ہو، اس کا خیال ان کے یہاں کافی ہے، اسی لیے اندر سے بہت گندے ہوتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ طہارت اللہ کے احکام پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ شریعت میں تفصیل سے طہارت کے احکام بتائے گئے ہیں، اسی لیے ایک صاحب ایمان جتنا طاہر ہوتا ہے، غیر مومن اتنا طاہر ہو ہی نہیں سکتا، اس کے یہاں ایسی قدریں ہیں ہی نہیں، ایسے احکام ہیں ہی نہیں، اس کی زندگی ایسی ہے ہی نہیں کہ وہ پاکیزہ رہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان سب حقائق کو سمجھنے کے بعد بھی انسان یہ نہ مانے کہ ہمارا پیدا

کرنے والا کون ہے؟ اس کا کیا مقام ہے؟ اس کے کیا اوصاف ہیں؟ اس کے کیا اسماء ہیں؟ اگر انسان یہ نہیں مانتا تو اپنی جگہ پر جائے، اور اس کی جگہ گندگی ہے، اور گندگی ظاہر ہے اس کا آسمان سے کوئی تعلق نہیں ہے، آسمان کے قریب بھی وہ نہیں جائے گا، اسی سنڈاس میں اس کو رہنا ہوگا، جس سنڈاس سے وہ آیا ہے اسی میں رہنا پڑے گا، اور اگر نکلنا چاہتا ہے تو اس کو طہارت وصفائی کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، وہ اختیار کرنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے میں سب سے بڑی چیز اللہ کا شکر ادا کرنا ہے، اور اگر ہم اللہ کو ناراض کردیں گے تو جس کے حکم سے سارا نظام چل رہا ہے اور جس نے یہ کہہ دیا ہے کہ ہماری بات مانو گے، ہم کو اپنا خالق مانو گے تو ہم تم کو اور نواز دیں گے، ورنہ ہم تم کو پستی کی طرف دھکیل دیں گے، سورۂ والتین میں اللہ نے فرمایا کہ ہم نے انسان کو بہترین کیفیت میں بنایا ہے، بہترین مزاج دیا ہے، اور اس کو ہم نے اسی کی جگہ پر واپس کردیا ہے، جہاں سے وہ پیدا ہوا ہے، اب وہاں سے اٹھنے کا کام انسان کا ہے، اتنا ہم نے کردیا کہ تم بہت گندے تھے، لیکن ہم نے تم کو صاف اور پاکیزہ ہونے اور بڑے ہونے کا طریقہ بتادیا ہے، اسی لیے ابھی ہم تم کو تمہاری جگہ پہنچادیتے ہیں، اور تم میں ہم نے پاک بننے کی، طاہر بننے کی، بڑا بننے کی، اور اونچا مقام حاصل کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، تم کو وہ طریقہ بتادیا ہے، لیکن اگر تم اٹھو ہی نہیں تو ظاہر ہے اپنی جگہ پر رہو گے، اور بالآخر تمہاری گندگی کو آگ جلائے گی، اگر تم دنیا میں اسی طرح گندے رہتے ہو تو جو جس میں مبتلا ہوگا اسی حساب سے اس کو جہنم کی آگ جلائے گی، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اپنے منصب کو پہچانیں اور اپنی ذمہ داری سے واقف ہوں، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کریں، اصل توحید یہ ہے کہ ہم اللہ کی کسی صفت میں، اللہ کے مقام کے کسی جز میں کسی کو شریک نہ سمجھیں، یہ یقین رکھیں کہ سب اللہ کرتا ہے اور کرواتا ہے، یعنی اللہ نے جس کو جو صلاحیت دی ہے اس کے حساب سے کرواتا ہے، آپ کو چاقو دیا ہے کہ اس سے آپ پھل کاٹیں تو چاقو دیا تب آپ کاٹ رہے ہیں، ورنہ نہیں کاٹ سکتے تھے۔

اللہ نے جو مخلوقات بنائی ہیں، ان سب کا کام مقرر کردیا ہے، اور ان کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، وہ اللہ کی مرضی کے مطابق سارا کام کرتے ہیں، اور یہ سب بنانے سے پہلے اللہ نے پورا نظام طے کردیا ہے کہ کون سی چیز کب ہوگی، کیسے ہوگی، کیا شکل ہوگی؟ ہم اپنے چھوٹے دائرہ میں سوچتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ کیسے ہوگا؟ لیکن جس نے آسمان بنایا، سورج اور چاند بنایا، وہ ہماری طرح کوئی چھوٹی باتیں نہیں سوچے گا، اسی نے بنایا ہے تو وہ جانتا بھی ہے، انسان کی مثال دیکھیں کہ ایک شخص نے دیوار بنائی ہے تو وہ جانتا ہے کہ ہم نے دیوار میں کس سائز کی اینٹیں رکھی ہیں، دیوار کتنی چوڑی بنائی ہے، اور اس میں گارا کیسا ہے، ظاہر ہے وہ جانتا ہے اس لیے کہ اس نے بنایا ہے، اسی طرح اللہ نے کائنات بنائی ہے، لہٰذا وہ اس کے ایک ایک جز سے واقف ہے، اور اللہ نے بنا کر چھوڑا نہیں، بلکہ وہ خود اس کو دیکھ رہا ہے کہ سب ہو رہا ہے یا نہیں، ظاہر ہے کہ اللہ نے کائنات کی چیزوں کو ایسا بنایا ہے کہ وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتے، وہ وہی کریں گے جو اللہ چاہتا ہے، اللہ نے ان کو جو اشارہ یا حکم دے دیا، ان کے لیے بس وہی کافی ہے، انسان کا حکم تو یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے الفاظ میں کسی سے کہیں کہ یہ کام کرو، ہم کوئی کام نوکر سے کروائیں تو کہہ کر کرائیں گے، اللہ کو اس کی بھی ضرورت نہیں ہے، اللہ نے چاہا تو چیز فوراً کام کرنے لگے گی۔

اللہ نے کائنات کا نظام بنایا اور وہی اس کو دیکھ رہا ہے، تو اس کی چاہ کے مطابق سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن وہ کبھی اس میں تبدیلی بھی کرتا رہتا ہے، جس کے واقعات سورۂ کہف میں بیان کیے گئے ہیں، اس سورہ میں تین تبدیلیاں مثال کے طور پر بیان کی گئی ہیں، تاکہ تم یہ سمجھ لو کہ اللہ نظام میں تبدیلی بھی کرتا ہے، ایک تو فطری نظام ہے جو اس نے بنادیا، جیسے؛ ڈھال آپ نے بنائی اور اس پر پانی چھوڑ دیا، اب پانی ڈھال پر جائے گا، یہ تو ایک تدبیر ہوگئی، لیکن پانی چلا اور آپ نے سوچا کہ آگے فلاں چیز ہے یہ بھی بہہ جائے گی، یہ نہ بہے تو آپ نے کوئی آڑ لگادی اور پانی نہیں نکلا، تو وہ چیز بنی رہی، تو اللہ یہ بھی کرتا ہے کہ جب کسی کا کام پسند آگیا، یا کسی بندہ کی بات پسند آگئی یا کسی پر خاص رحم فرمانا ہوا تو جو نظام چل رہا ہے، اس میں تھوڑی تبدیلی کردیتا ہے، سورۂ کہف میں تین واقعات بیان ہوئے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا تھا کہ حضرت خضر کے پاس جاؤ، تو وہ دونوں نکلے تھے ایک کشتی پر بیٹھ کر دریا پار کرنے، وہ کشتی نئی تھی اور کشتی والے کی آمدنی کا ذریعہ وہی کشتی تھی، کشتی والے نے ان کو نیک سمجھ کر بٹھایا اور ان سے پیسے بھی نہیں لیے، مگر حضرت خضر نے کشتی کا ایک تختہ ذرا سا معیوب کردیا کہ جس سے کشتی خراب ہوگئی، جب حضرت موسیٰ نے اعتراض کیا تو انہوں نے کہا: ہم بعد میں بتائیں گے، لہٰذا جب اور آگے چلے تو ایک لڑکا ماردیا جو کھیل رہا تھا، حضرت موسیٰ نے پھر اعتراض کیا کہ ایک کھیلتے لڑکے کو کیوں ماردیا، انہوں نے پھر وہی جواب دیا، پھر ایک جگہ دیوار گرنے والی تھی اس کو حضرت خضر نے ٹھیک کردیا، اب موسیٰ علیہ السلام نے پھر سوال کیا کہ تم کیا کر رہے ہو؟ تو پھر انہوں نے پہلا واقعہ بتایا کہ وہ کشتی نئی تھی، اور یہاں کا

جو حاکم ہے اس کی ایک بری عادت ہے کہ جو نئی کشتی ہوتی ہے، اس کو وہ لے لیتا ہے اور اس پر قبضہ کر لیتا ہے، چونکہ یہ اس کی نئی کشتی تھی اور یہی اس کی روزی تھی، وہ کشتی اس کی بادشاہ کے ہرکارے لے جاتے، تو اللہ نے چاہا کہ اس کی کشتی محفوظ رہے، اس لیے اس کو خراب کر دیا، تاکہ اب بادشاہ کے ہرکارے کشتی کو خراب دیکھ کر نہ لے جائیں، یہ اس کی نیکی سے اللہ نے گویا اس کی کشتی کو بچالیا، اور دوسرے واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو لڑکا کھیل رہا تھا، اس بچہ کو ایسا ماحول ملنے والا تھا، ایسے حالات پیش آنے والے تھے کہ وہ اپنے باپ کے لیے مصیبت بن جاتا، اور معلوم نہیں کہ وہ کیا کرتا، کافر ہوتا یا کیا ہوتا، اور باپ بیچارے نیک تھے، لیکن ان کا لڑکا ان کے لیے بڑھاپے میں مصیبت بن جاتا، تو اللہ نے چاہا کہ اس کو دنیا سے رخصت کرالیا جائے، اس کو اللہ اس کے بجائے اب مزید اولاد دیگا، تاکہ باپ کی خوشی باقی رہے، یعنی نیکی کا صلہ اللہ دنیا میں بھی دے دیتا ہے، آخرت میں تو ملے گا ہی، لیکن دنیا میں بھی دیتا ہے، تو معلوم ہوا کہ اللہ اپنے نظام میں تبدیلی کرتا رہتا ہے، ہر چیز اس کے کہنے ہی سے ہو رہی ہے، بس یہ فرق ہے کہ اس نے کہیں ذرا سا نظام بدل دیا۔

توحید کی حقیقت بہت گہرائی سے سمجھنی چاہیے، توحید میں یہ بھی ہے کہ سب کچھ اللہ کرتا ہے، اور ہم اللہ کے تابع ہیں، اور اللہ کا ہم پر بے حد و حساب انعام ہے، ہم کو کہاں سے کہاں اللہ نے پہنچا دیا، ہم ذلیل وخوار تھے، اور ذلیل وخوار ہوتے لیکن اللہ نے ہم کو عزت دی، اب جب کہ انسان اس حقیقت کو نہیں مان رہا ہے، اور اپنے کو گندگی میں رکھنا چاہتا ہے، تو اللہ کو کتنا ناپسند ہوگا، اسی لیے اس کے بعد اللہ نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے نبی بھیجے، تاکہ یہ حجت پوری ہو جائے کہ ہم نے تمہارے اوپر کوئی ظلم نہیں کیا ہے، گویا اللہ کی طرف سے تمہارے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ تم کوئی عذر سنا سکو، دنیا میں اس کے نبی سمجھا رہے ہیں کہ توحید اختیار کرو، اللہ کو مانو، اللہ قادر ہے، وہ خالق ہے، اسی نے تم کو سب کچھ دیا ہے، اس کو مانو، اور اس کا شکر ادا کرو، شکر عبادت کرنا ہے، تو اللہ کی عبادت کرو، اب بجائے اس کے کہ تم اس نصیحت کو مانو، الٹا ان کے پیچھے پڑ گئے، ان کا رہنا دشوار کر دیا، ان کو ایذاء پہنچا رہے ہو، ان کو مار رہے ہو، ان کے قتل کے درپے ہو، یہ واقعی کتنی بری بات ہے، اور تم یہ حرکت کہاں کر رہے ہو؟ اس جگہ کر رہے ہو کہ جو جگہ اللہ نے بہت پاکیزہ بنادی ہے، اس زمین کی یہ جگہ اللہ نے آسمان جیسی طاہر و پاک بنادی ہے، وہ پاکیزگی اس زمین میں بھی رکھی ہے، یوں زمین تو گندی، پست اور حقیر ہے، لیکن اس جگہ کو اللہ نے نوازا ہے کہ یہاں جو اللہ کی عبادت کرے گا اس کا بہت اونچا مقام ہے، جیسا کہ آتا ہے کہ حرم میں ایک نیکی کے بجائے ایک لاکھ نیکی، لیکن اگر وہاں کوئی برا کام کرے تو اسی حساب سے اس پر اللہ کی ناراضگی بھی ہوگی کہ تم یہ حرکت کہاں کر رہے ہو، ذرا یہ بھی تو سوچو، عام جگہ ہو تو بھی سہی ہے، لیکن بیت اللہ میں کر رہے ہو، نبی کو پریشان کر رہے ہو، جو ہدایت کا کام کر رہے ہیں ان کو پریشان کر رہے ہو، سورۂ حج میں اس ذکر کے بعد اللہ نے اس جگہ کی پاکیزگی اور اس کے مقام کا ذکر کیا کہ اس جگہ کو ہم نے نواز دیا ہے، اور حضرت ابراہیم سے کہا کہ تم یہاں گھر بناؤ، اور اعلان کر دو کہ یہاں جو آئے گا، اور عبادت کرے گا ہم اس کو نواز دیں گے، اس کو اونچا مقام دیں گے، جو یہاں کا حق ادا کرے گا، اور حضرت ابراہیم سے فرمایا کہ ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ تمہارا یہ اعلان تمام لوگوں کے دلوں تک پہنچ جائے گا، اور یہاں لوگ دور دور سے آئیں گے، اور مشکل مشکل مقامات سے آئیں گے، تکلیفیں اٹھا کر آئیں گے، صبر و برداشت کے ساتھ آئیں گے، اس طرح کہ دوسری جگہ آدمی ایسی محنت نہیں کر سکتا، چنانچہ اسلام سے پہلے بھی یہ تھا کہ پورے جزیرۃ العرب سے لوگ وہاں پہنچتے تھے، سب وہاں حج کرنے جاتے تھے، اور جو حج کے لیے جاتا تھا، سب اس کی حفاظت کرتے تھے، اس کو راستے میں کوئی نہیں چھیڑتا تھا، دور دور سے لوگ وہاں جاتے تھے، کافر و مشرک ہونے کے باوجود یمن ونجد سے عرب حج کرنے جاتے تھے، بلاشبہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعلان کا اثر تھا۔

آگے فرمایا کہ یہاں کی ایک بہت بڑی عبادت یہ ہے کہ جانور لا کر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے، اور یہ سلسلہ دوسری شریعتوں اور مذاہب میں بھی رہا ہے کہ وہ اپنے خدا کے لیے جانور ذبح کرتے تھے، جس کو خدا مانتے تھے اس کو راضی اور خوش کرنے کے لیے جانور کی قربانی دیتے تھے، اس زمانہ میں جانور کی قربانی بہت اہم تھی، اس لیے کہ اس زمانہ کا نظام ایسا تھا کہ سکے کی دولت بہت کم تھی، زیادہ تر صرف متمدن علاقوں میں سکوں کی دولت تھی، ورنہ سامان ہی انسان کی دولت تھا اور جانور خاص طور پر، جانور چھوٹے بڑے ہر طرح کے ہیں، ان کی قیمتیں الگ الگ ہیں، تو وہ ان سے اپنی دوسری ضروریات پوری کرتے تھے، مثلاً: خون بہا دینا ہے تو سو اونٹ کا خون بہا دے دیا، فلاں کام ہے، فلاں چیز حاصل کرنی ہے تو اتنے اونٹ دے کر یا اتنی بکریاں دے کر حاصل کر لی، گویا اس زمانہ میں جانوروں کی حیثیت ایک سکہ کی تھی، ان سے کام چلتا تھا، ظاہر ہے کہ چھوٹا جانور بھی ایک قیمت رکھتا ہے، جس طرح سو اور پچاس روپئے کا نوٹ ایک قیمت رکھتا ہے، لہٰذا جانور ذبح کرنا گویا اپنے جانوروں میں سے خرچ کرنا ہے، تو لوگ یہ کرتے

تھے کہ جن کو خدا بنالیا تھا، ان کو راضی کرنے کے لیے، اوران سے اپنی فرمائش پوری کرنے کے لیے ان کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے، اب یہ بات مسلمانوں میں بھی آگئی ہے کہ پیروں کے نام پر جانور ذبح کرتے ہیں، اور اس کو عبادت کی شکل دیتے ہیں، ظاہر ہے یہ کفروشرک ہے، اللہ کے نام کے ساتھ کسی اور نام پر جانور ذبح کرناوہ اس جانورکو حرام کردیتا ہے، قرآن مجید میں اس کا صاف تذکرہ ہے، اس جانورکا گوشت حلال نہیں حرام ہے، تواس زمانہ میں ایک عام رواج تھا کہ لوگ منتیں مانگتے تھے اور جانور ذبح کرتے تھے، تو اللہ نے یہاں بھی یہ نظام باقی رکھا کہ جولوگ حج کرنے آئیں وہ جانور لے آئیں، جن کو اللہ کے نام پر ذبح کریں، یعنی وہ لوگ قربانی دیں گے، اور ظاہر ہے آج کل بھی دیکھ لیجیے کہ جولوگ حج میں قربانی کرتے ہیں تو ایک جانور پر خاصا خرچ آجاتا ہے، یعنی یہاں کے حساب سے بیس پچیس ہزار ایک جانور پر خرچ آجاتا ہوگا، معلوم ہوا وہاں کی قربانی بہت بڑی ہوئی، مگر یادرہے اللہ کے نام پر قربانی ہو، کسی اور کے نام پر نہیں، اسی لیے یہ بھی فرمایا گیا کہ جوجانور اللہ کے نام پر ذبح کے لیے یہاں لائے جائیں، ان کا احترام کرنا چاہیے، اس لیے کہ وہ اللہ کے نام پر جارہے ہیں، لہٰذاان کونقصان نہیں پہنچانا چاہیے، بلکہ ان کا ادب رکھنا چاہیے، اور یہ بھی فرمایا کہ جو اللہ کے نیک بندے ہیں وہ ان چیزوں کا خیال رکھتے ہیں اور حقوق ادا کرتے ہیں، اور شکر کا جو طریقہ ہے، یعنی نماز ہے، زکاۃ ہے اور خیر کے کاموں میں لگنا ہے، اللہ کے نیک بندے یہ سب کچھ کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ بڑے اونچے مقام تک پہنچائے گا۔

☆☆☆☆☆

نکاح میں کفو کی رعایت

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ

یہ بات اکثر سننے دیکھنے میں آتی رہتی ہے کہ لوگ برادری میں نکاح کرنے کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں کے شکار ہیں، یہ درست ہے کہ شریعت نے نکاح کے معاملے میں ایک حد تک کفو کی رعایت رکھی ہے؛ لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ نکاح چونکہ زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے، اس لیے میاں بیوی اور دونوں خاندانوں کے درمیان طبعی ہم آہنگی ہو، ان کے رہن سہن، ان کے طرز فکر اور ان کے مزاج میں اتنی دوری نہ ہو کہ ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرنے میں مشکل پیش آئے؛ لیکن اول تو کفو کی اس رعایت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر کفو میں کوئی رشتہ نہ ملے تو یہ قسم کھالی جائے کہ اب زندگی بھر شادی نہیں ہو سکے گی، دوسرے کفو کا مطلب یہ نہیں کہ خاص اپنی برادری ہی میں رشتہ کیا جائے اور برادری کے باہر سے جو بھی رشتے آئیں انہیں غیر کفو قرار دیا جائے، اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے جنہیں نظر انداز کرنے سے ہمارے معاشرے میں بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں:

۱- ہروہ شخص کسی لڑکی کا کفو ہے جو اپنے خاندانی حسب نسب، دین داری اور پیشے کے لحاظ سے لڑکی اور اس کے خاندان کا ہم پلہ ہو، یعنی کفو میں ہونے کے لیے اپنی برادری کا فرد ہونا ضروری نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص کسی اور برادری کا ہے؛ لیکن اس کی برادری بھی لڑکی کی برادری کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہے تو وہ بھی لڑکی کا کفو ہے، کفو سے باہر نہیں ہے مثلاً سید، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی، بلکہ تمام قریشی برادریاں پائی جاتی ہیں، وہ بھی اکثر ایک دوسری کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے کفو ہیں۔

۲- بعض احادیث وروایات میں یہ ترغیب ضرور دی گئی ہے کہ نکاح کفو میں کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ دونوں خاندانوں کے مزاج آپس میں میل کھاسکیں؛ لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ کفو سے باہر نکاح کرنا شرعاً بالکل ناجائز ہے یا یہ کہ کفو سے باہر شرعاً درست نہیں ہوتا، حقیقت یہ ہے کہ اگر لڑکی اور اس کے اولیاء کو کفو سے باہر کوئی مناسب رشتہ مل جائے تو وہاں شادی کردینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کفو میں رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے لڑکی کو عمر بھر بغیر شادی کے بٹھائے رکھنا کسی طرح جائز نہیں۔

۳- شریعت نے یہ ہدایت ضرور دی ہے کہ لڑکی کو نکاح بغیر ولی کے نہیں کرنا چاہیے (خاص طور سے اگر کفو سے باہر نکاح کرنا ہو تو ایسا نکاح اکثر فقہاء کے نزدیک بغیر ولی کے درست نہیں ہوتا) لیکن ولی کو بھی یہ چاہیے کہ کفو کی شرط پر اتنا زور نہ دے جس کے نتیجے میں لڑکی عمر بھر شادی سے محروم ہو جائے اور برادری کی شرط پر اتنا زور دینا تو اور بھی زیادہ بے بنیاد حرکت ہے، جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ایک حدیث میں حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اذا جاء کم من ترضون دینہ وخلقہ فزوّجوہ الا تفعلو ا تکن فتنة فی الأرض وفساد کبیر" (جب تمہارے پاس کوئی رشتہ لے کر آئے جس کی دینداری اور اخلاق پسند ہوں تو اس سے (اپنی لڑکی کا) نکاح کردو، اگر تم ایسا نہیں کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ وفساد برپا ہو جائے گا)۔

☆☆☆

فکر و نظر

قوموں کی ترقی کا راز

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

ہمارا دین مستقبل سے مایوس ہونے کی تعلیم نہیں دیتا، اور نہ معرکۂ حیات سے پیچھے ہٹنے کی اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کی تلقین کرتا ہے، کام کتنا ہی معمولی ہو، وسائل خواہ کتنے ہی کم ہوں، ذرائع کتنے ہی محدود اور ناقابل التفات ہوں، اسلام ہمیں آگے بڑھنے کے لیے ترغیب دلاتا ہے، اور نتائج کو اللہ کے حوالہ کرنے کی تعلیم دیتا ہے، اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ انسان اپنی کوشش کے بقدر نوازا جاتا ہے، کامیابی و کامرانی کا انحصار اس کی سعی اور کوشش پر ہے، نہ کہ سستی و کاہلی پر اور کمزوری پر۔ قرآن مجید میں ہے: ”وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى وَ أَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَى، ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَى“ [سورة النجم: ۳۹-۴۱] (انسان کو وہی ملتا ہے جس کی اس نے کوشش کی، اور اس کی کوشش نتیجہ خیز ہوگی، پھر اس کو اس کا بھرپور بدلہ ملے گا)۔ کسے معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھرپور بدلہ کیا ہے؟ اور کون اپنے حاشیہ خیال میں لاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مکمل انعام کس صورت میں ظاہر ہوگا؟ زبان نبوت نے اشارہ کیا ہے: ”أعددتُ لعبادي ما لا عين رأت، ولا أذن سمعت، ولا خطر على قلب بشر“ (میں نے اپنے بندوں کے لیے تیار کی ہے، وہ چیز جس کو کسی آنکھ نے نہ دیکھا، اور کسی کان نے نہ سنا، اور نہ کسی دل میں اس کا خیال آیا)۔

انسان کی قیمتی متاع

اس عالم فانی میں انسان کے لیے وقت ایک ایسی متاع بیش بہا ہے جو ہاتھ سے نکل جانے کے بعد کسی قیمت کے عوض واپس نہیں لائی جاسکتی، دنیا کی نایاب سے نایاب شے کے ملنے کی توقع ہر وقت کی جاسکتی ہے اور بڑے سے بڑے نقصان کی تلافی کا امکان موجود ہے، لیکن وقت انسان کی وہ کنجی ہے جو کھو جانے پر پھر واپس نہیں مل سکی، اور زندگی کا قفل پھر ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا ہے، اسی لیے وقت کو انسان کی سب سے اہم ترین اور قیمتی متاع بتایا گیا ہے اور ہر دور کے عقل مند انسانوں نے اس کی قدر کی ہے اور اس کی حفاظت کا مکمل انتظام کیا ہے۔

آپ اپنی زندگی کی تاریخ پر نظر ڈالئے، اور اس وقت کا احساس کیجیے جب سے آپ نے زندگی کا سفر شروع کیا ہے اور دنوں پھر مہینوں کو شمار کرنا شروع کیجیے، تو آپ کو اپنے وقت کا حساب لگانے میں ذرا بھی دقت نہیں پیش آئے گی اور ایسا معلوم ہوگا جیسے ابھی ابھی کل ہی کی بات تو ہے، دنیا کی زندگی میں جس طرح یہ احساس پیدا ہوتا ہے، بالکل قیامت کے دن حساب کے موقع پر اسی احساس سے دوچار ہونا پڑے گا، قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: ”وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ“ [سورہ یونس: ۴۵] (اور جس دن اللہ ان کو جمع کرے گا تو وہ دنیا کی نسبت ایسا خیال کریں گے کہ گویا وہاں گھڑی بھر دن سے زیادہ رہے ہی نہیں تھے، اور باہم ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے)۔

لیکن دنیا کے لوگوں کی حالت کتنی عجیب ہے کہ قضا و قدر ان کو متنبہ کر رہی ہے، اور وہ اس سے غافل ہیں، ان کی زندگی کی قیمتی ساعت پوری برق رفتاری کے ساتھ گذر رہی ہے، لیکن وہ اس حقیقت سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔

ایمان اور تقوی کی علامت

اسلام دین رحمت ہے، وہ زندگی کی تنظیم کرتا ہے اور اس کو خوشگوار بنانے کے لیے وہ ایسا نظام مرتب کرتا ہے جو ایک مثالی معاشرہ کو وجود میں لائے جس کی بنیاد اعلیٰ انسانی قدروں پر قائم ہو، لیکن مثالی معاشرہ اسی وقت برپا ہو سکتا ہے، جب اس کا ہر فرد اپنے وقت کی قیمت اور اپنے لمحات کی اہمیت کو بھی سمجھتا ہو، وہ اس اصول سے پوری طرح واقف ہو کہ ”الوقت كالسيف، إن لم تقطعه قطعك“ (وقت ایک تلوار ہے اگر تم اس سے کاٹنے کا کام نہیں کرو گے تو کسی دن وہ تم کو کاٹ دے گی)۔

انسان اپنے وقت کی قیمت پہچانے اور اس سے کام لے، یہ بھی ایمان اور تقویٰ کی علامت ہے، زمانے کے الٹ پھیر اور لیل و نہار کی گردش سے سبق حاصل کرنا اہل تقویٰ کا شعار ہے، وہ اس سے سبق لے کر اپنے قیمتی وقت کو اس کام میں لگاتے ہیں جو آنے والی زندگی میں ان کی مدد کر سکے۔

اسلام نے عبادات کے اندر بھی وقت کی اہمیت اور ترتیب کا پوری طرح لحاظ رکھا ہے، پنج گانہ نمازوں میں وقت کی ترتیب کس قدر نمایاں ہے، سال میں مقررہ وقت پر روزہ کی عبادت، زکوٰۃ اور حج کی عبادت یہ سب کچھ اس بات کا مظہر

ہے کہ اسلام وقت کی قیمت کا کس قدر قائل ہے۔

زندگی کو منظم اور با مقصد بنانے میں وقت کی ترتیب اور اس کے نظام کو بڑا دخل ہے، اسی لیے ایک مسلمان کے نزدیک ہر کام کا ایک وقت اور ہر عمل کی ایک ترتیب مقرر ہے۔

انسان اپنی ذمہ داری کو اسی وقت امانتداری کے ساتھ ادا کرسکتا ہے جب وہ وقت کی اہمیت کا پورا احساس رکھتا ہو، وہ سمجھتا ہو کہ کام کو اس کے مقررہ وقت میں انجام دینا خوشگوار زندگی حاصل کرنے اور مثالی معاشرہ قائم کرنے میں سب سے زیادہ معاون ہے۔

وقت کی قیمت کو سمجھنے والے اور اس کی اہمیت کا احساس رکھنے والے ہر زمانہ میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، خالص مادی نقطۂ نظر سے وقت کی قیمت کو سمجھنے والے بھی مادی حیثیت سے دوسروں کے مقابلہ میں کم ہیں، مادہ پرست قوموں نے بھی جب وقت کی قدر کی اور اس سے پورا فائدہ حاصل کیا تو زندگی کے میدان میں وہ آگے بڑھ کر رہیں، اور اپنی حریف قوموں کے مقابل میں وہ مادی ترقیوں میں اتنی آگے نکل گئیں کہ کوئی ان کے مدمقابل آنے کی ہمت نہ کرسکا۔

قوموں کی ترقی کا راز

آج بھی دنیا کی جن قوموں نے وقت کی قیمت کو محسوس کرلیا، وہ تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگیں، اور انہوں نے ایسے حیرت ناک کارنامے انجام دیے جو اہل زمانہ کی نگاہوں کو خیرہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

مسلمان کا ہر لمحہ اس کے لیے خیر و برکت کا پیغام ہے اور خوشگواری و مسرت کا انعام ہے، بشرطیکہ وہ اس سے مستفید ہو، اور صحیح معنوں میں اس کی قیمت سمجھ سکے، اس لیے کہ گذرا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آسکتا، اور نہ اس کی تلافی کی کوئی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دن کے شروع ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منادی یہ اعلان کرتا ہے کہ اے ابن آدم! میں ایک مخلوق ہوں اور تمہارے اعمال پر گواہ ہوں، اس لیے جو عمل صالح کرنا ہو کرلو، ورنہ یاد رکھو میں واپس نہیں آسکتا، قرآن مجید نے بھی اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا ہے: ”وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَنْ يَّذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُوْرًا“ [سورہ فرقان: ۲۵] (ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا نظام اللہ تعالیٰ نے بنایا، ہر اس شخص کے لئے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے اور شکر گذار بننا چاہے)۔

قوموں کی ترقی کا راز وقت کی ترتیب و تنظیم میں جس حد تک مضمر ہے کسی اور چیز میں نہیں، تاریخ کی کتنی بڑی بڑی شخصیتیں وقت کی قیمت پہچاننے کے بعد اس منزل پر پہنچیں جہاں سے انہوں نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جو تاریخ کے صفحات پر نقش ہیں۔

آج بھی اور ہر زمانہ میں تاریخ کا ہیرو، قوموں کا قائد اور مثالی شخص وہی شخص ہوسکتا ہے جو اپنے وقت کی قدر پہچان کر اس سے پوری طرح مستفید ہوسکے۔

انسان کی عمر اس کا سب سے عظیم سرمایہ ہے، قیامت کے دن جن چار باتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ سوال کرے گا، ان میں سب سے مقدم یہی سوال ہوگا کہ اس نے اپنی عمر کس چیز میں گذاری، حدیث شریف میں وارد ہے کہ قیامت کے دن کسی بندہ کا قدم اس وقت تک اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا جب تک کہ اس سے چار چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرلیا جائے، عمر کے بارے میں کہ کس مشغلہ میں گذاری، جوانی کے بارے میں کہ اس کو کس کام میں لگایا، مال کے بارے میں کہ اس کو کہاں سے کمایا اور کس جگہ صرف کیا، علم کے بارے میں کہ اس کے مطابق کہاں تک عمل کیا۔

جس بامقصد صحافت کا ہم نے بیڑہ اٹھایا ہے کہ وہ عالمی ترقی یافتہ صحافت کے مقابلہ میں بہت معمولی ہے، اور وہ بھی وقت اور سال کے دائرہ سے باہر نہیں ہے، اور اس کی مثال بظاہر ایسی ہے جیسے کسی بڑے اور کشادہ نقشے میں ایک چھوٹا سا نقطہ اور پوائنٹ ہوتا ہے، لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود ہم اس کے لیے بالکل تیار نہیں کہ اوہام و خرافات کا ہمارے اوپر غلبہ ہو، اور ہم یاس و ناامیدی کے شکار ہوجائیں، اور میدان عمل چھوڑ دیں، حالات کے مقابلہ سے پیچھے ہٹ جائیں، اور دوسروں کی راہ ہموار کرنے لگیں تاکہ وہ ہماری قدیم اقدار و روایات مسمار کرکے ہمارے معاشرہ میں لاقانونیت پھیلائیں، اباحیت کو فروغ دیں، اور لوگوں میں اخلاقی بیماریوں کو عام کریں۔

اگرچہ ہماری صحافت بظاہر موجودہ سیلاب بلاخیز کو روک نہیں سکتی، لیکن ہم اس کے اثرات اور نتائج کے مکلّف نہیں، بلکہ سعی و عمل اور جدوجہد کے ذمہ دار ہیں، ہم ان حالات میں کس طرح حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے کو تیار کرتے ہیں؟ اور اپنے وسائل و ذرائع کو اس مقصد کے کس حد تک وقف کرتے ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جو ہر باضمیر کو سوچنے پر آمادہ کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حادثۂ فاجعہ

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ - کچھ یادیں کچھ باتیں

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

ایک طویل علالت کے بعد بالآخر مولانا محمود حسن حسنی ندوی بھی ہم سے رخصت ہوگئے، کل تک ہم ان سے بات کرتے تھے، آج ہم ان کی باتیں کریں گے، ان کی خوبیوں اور نیکیوں کی بات کریں گے، وہ خوبیاں اور نیکیاں جو مادیت کے اس دور میں اب کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں اور اگر ملتی بھی ہیں تو صرف ان حضرات کے یہاں جو دین کے پابند، شریعت کے تابع اور صرف اور صرف رضائے الٰہی کے طلبگار ہوتے ہیں، جو دنیا میں رہتے ہیں ایک مسافر کی طرح، زندگی گذارتے ہیں ایک زاہد کی طرح، جو لینے پر نہیں، دینے پر یقین رکھتے ہیں، اپنی فکر کم دوسرے کی فکر زیادہ رکھتے ہیں، اپنا شوق نہیں صرف اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں، جن کی نظر منزل پر ہوتی ہے اور منزل کی راہ میں حائل روڑوں کو جن کو مادہ پرست نگاہیں ہیرے جواہرات سمجھ کر چکا چوند ہونے لگتی ہیں، ان روڑوں کو ٹھوکر مار کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتے ہیں، ہمارے محمود حسن حسنی ندوی مرحوم بھی انہی مبارک اور کامیاب ہستیوں میں سے ایک تھے۔

وہ عمر میں تقریباً مجھ سے دس سال چھوٹے تھے؛ لیکن علم اور عمل میں وہ مجھ سے کئی سال بڑے تھے، ان کا کمال تھا کہ رشتہ اور عمر کے اس فرق کا ہمیشہ انہوں نے لحاظ رکھا اور وہ ادب برابر ملحوظ رکھا جو ایک بھانجہ اپنے ماموں کے ساتھ رکھتا ہے، میں تو پھر بھی ان سے دس سال بڑا تھا، مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی تو عمر میں ان سے صرف دو ڈھائی سال ہی بڑے تھے، درجہ کا فرق بھی ایک ہی دو سال کا رہا ہوگا، ہر کام میں شریک، ہم خیال اور ایک دوسرے کے معاون، لیکن چونکہ بلال رشتہ میں بڑے تھے، ماموں لگتے تھے چنانچہ محمود مرحوم اس رشتہ سے ان کا پورا ادب کرتے تھے، احترام کرتے تھے، اور پوری اہمیت دیتے تھے۔

مرحوم محمود حسنی عقائد میں، عبادات میں، اخلاق میں، معاملات میں، سخاوت وفیاضی میں، مہمان نوازی میں، صلہ رحمی میں، پڑوسیوں کا خیال رکھنے اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں ہم سب کے لیے ایک نمونہ ہیں، وہ جو تھے وہی نظر آتے تھے اور جو نظر آتے تھے وہی تھے، نہ ان کے چہرہ پر تقوی کا کوئی نقاب تھا اور نہ ان کے جسم پر تصوف کا کوئی لبادہ، تقوی ان کے اندر تھا اور حقیقی تصوف جس نے ان کو احسان کے مرتبہ تک پہنچا دیا تھا، ان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہا تھا، ظاہر وباطن کی ایسی یکسانیت جو صرف اللہ والوں کے یہاں ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

مرحوم کی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ مہمان کسی کا ہو، ملنے کسی اور سے آیا ہو، اس کی خاطر داری وہ ایسی کرتے کہ جیسے وہ انہی کا مہمان ہے اور صرف انہی سے ملنے کے لیے آیا ہے، رشتہ دار کے ساتھ معاملہ ایسا کرتے کہ لگتا کہ سب سے زیادہ قریبی رشتہ اس کا انہی سے ہے، وقت بھی دیتے، تواضع بھی کرتے، رشتہ کی نوعیت بھی بتاتے اور دوسرے رشتہ داروں کا تعارف بھی کراتے۔

انہوں نے اپنے ددھیال اور ننہیال دونوں کی خوبیاں پائی تھیں، ان کے اندر تواضع بھی تھی، انکساری بھی تھی اور بے نفسی بھی، ایمانی حمیت بھی تھی، عقیدہ کی پختگی بھی تھی، شرک وبدعت سے نفرت بھی تھی اور حق کے معاملہ میں بے لچک رویہ بھی، ان کو اپنی ذات کے لیے کبھی غصہ ہوتے نہیں دیکھا گیا، ہاں اگر دین وشریعت کے خلاف کوئی بات ہوتی، یا جمہور اہل سنت والجماعت کے موقف سے ہٹ کر کوئی موقف پیش کیا جاتا، یا کسی نیک بندہ پر کوئی غلط تبصرہ ہوتا یا کسی بزرگ شخصیت کے ساتھ بے ادبی کا کوئی معاملہ ہوتا تو پھر ان کا طیش میں آنا طے تھا اور سخت لہجہ میں نکیر کرتے تھے یا تو اپنی بات منوا لیتے یا اس مجلس سے اٹھ کر چلے جاتے کیوں کہ وہ جانتے تھے اور صرف جانتے ہی نہیں، تاریخ کی کتابوں میں محفوظ وہ واقعات ان کی نظروں کے سامنے تھے جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اللہ کے نیک بندوں کے سلسلہ میں کی گئی بے بنیاد باتوں کے نقصانات پہنچ کر رہتے ہیں۔

حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنی والدہ کے حکم پر اپنے کو اپنے نانا مولانا سید محمد ثانی حسنی ندویؒ کے دونوں بھائیوں مولانا محمد رابع حسنی ندوی (دامت برکاتہم) اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوری طرح طرح حوالہ کر دیا تھا، انہی کے ساتھ قیام، انہی کے ساتھ سفر، انہی کے علمی کاموں میں معاونت، انہی کے ساتھ کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت، انہی کے ساتھ معروف ومشہور علمی شخصیات سے ملاقاتیں اور اپنے علمی وتصنیفی کاموں میں انہی دونوں حضرات سے رائے اور مشورہ اور پھر انہی کی رائے اور انہی کے مشورہ پر عمل، یہ وہ چیز تھی جس نے ان کی شخصیت کو سنوارنے اور ان کی افادیت کے دائرہ کو وسیع کرنے کا کام کیا اور ان دونوں حضرات کے ساتھ اسفار کا ایک فائدہ ان کو یہ

بھی ہوا کہ وہ تقریر کے میدان میں بھی آ گئے، وہ مجلسوں میں تو بولتے تھے اور پوری قوت سے بولتے تھے؛ لیکن اسٹیج سے دور رہتے تھے، لیکن اسفار میں یہ ہوتا تھا کہ بعض جلسوں میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی جگہ ان کو تقریر کرنی پڑ جاتی تھی، کیوں کہ ہر جلسہ میں مولانا جا نہیں سکتے تھے، لہٰذا وہ محمود مرحوم کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیج دیتے تھے، اس طرح محمود مرحوم دھیرے دھیرے مقرر بھی بن گئے۔

محمود مرحوم کے بارے میں یہ بات تقریباً یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ جو کام کرتے تھے، اللہ کے لیے کرتے تھے، قریب ہوتے تو اللہ کے لیے، دور ہوتے تو اللہ کے لیے، ناطہ توڑتے تو اللہ کے لیے، ناطہ جوڑتے تو اللہ کے لیے، اپنی کوئی مصلحت، اپنا کوئی مفاد، اپنی کوئی غرض اور اپنی کوئی ضرورت ان کے پیش نظر نہیں ہوتی تھی، سات قسم کے لوگوں کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ اس دن عرش کے سایہ میں ہوں گے جس دن سوائے عرش کے سایہ کے کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا، محمود مرحوم میں ایسی کئی چیزیں پائی جاتی تھیں، یقین ہے کہ ان سات قسم کے لوگوں میں ان کا بھی شمار ہوگا۔

سیاست اور سیاسی لوگوں سے محمود مرحوم کو ذرا بھی دلچسپی نہ تھی، نہ انہیں ان کو دیکھنے کا کوئی شوق تھا اور نہ ان سے ملنے کی ان کو کوئی خواہش، ندوہ کے مہمان خانہ میں جب اس طرح کے سیاسی لیڈروں کی آمد ہوتی تو ہر آدمی کو شوق ہوتا کہ ان کو دیکھے، ان کی باتیں سنیں اور اگر ہو سکے تو ان کے ساتھ ایک آدھ تصویر بھی کھنچوالے، لیکن اس موقع پر محمود مرحوم یا تو دوسرے کمرے میں جا کر اپنے کسی علمی کام میں مشغول ہو جاتے یا پھر وہ والد محترم مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ گھر چلے آتے کیوں کہ ان کو ذرا بھی اس طرح کے لوگوں سے مناسبت نہ تھی، وحشت تھی، یوں تو جب گھر آتے تو عام طور پر تینوں یعنی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی اور مرحوم محمود حسن حسنی ساتھ ہی آتے تھے، لیکن جب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے بغیر یہ دونوں حضرات آتے تو میں سمجھ جاتا تھا کہ آج ندوہ میں کسی سیاسی لیڈر کی آمد ہے۔

لیکن یہی محمود دوسری طرف دینی شخصیات سے ملنے ان کی ضیافت کرنے اور ان کا استقبال کرنے میں سب سے آگے نظر آتے تھے، اس موقع پر ان کی خوشی دیکھنے کے لائق ہوتی تھی، ایک ایک کو ملواتے، تعارف کراتے اور دعائیں دلواتے، سر پر ہاتھ پھرواتے، اور اپنی کتابیں ان کو ہدیہ کرتے۔

زمین، جائیداد، کاروبار اور دنیاداری کے معاملات سے محمود مرحوم کو ذرا بھی مناسبت نہ تھی، اس کا ذکر بھی ہوتا تو وہ اپنے چھوٹے بھائی مسعود حسن حسنی ندوی کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ یہ معاملات ان کے ذمہ ہیں، یہ جانیں اور ان کو بھی یہ نصیحت کرتے کہ دیکھو ان چیزوں کے چکر میں زیادہ نہ پڑنا، وقت بہت قیمتی ہے، اس کو اسی کام میں لگاؤ جو آخرت میں کام آئے، یہ سب چیزیں تو یہیں رہ جائیں گی، بس جتنا ضروری ہو اتنا ہی کرو۔

محمود مرحوم کا مزاج توڑنے کا نہیں، جوڑنے کا تھا، دور کرنے کا نہیں، قریب لانے کا تھا، فاصلے بڑھانے کا نہیں، فاصلے گھٹانے کا تھا، ادارہ کو ادارہ سے، شخصیت کو شخصیت سے، تحریک کو تحریک سے جوڑنے کا کام گویا ان کا من پسند کام تھا، ندوی، قاسمی اور مظاہری سب کو انہوں نے جوڑ رکھا تھا، بدگمانیوں کو دور کرتے، غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے، ایک کی دوسرے سے تعریف کرتے اور ایک کے سامنے دوسرے کے اچھے پہلو بیان کرتے اور یہ کام بڑے اخلاص کے ساتھ اور بڑی خوش اسلوبی اور سلیقہ مندی کے ساتھ انجام دیتے۔

نیکی کی بہت سی قسمیں آپ نے دیکھی ہوں گی؛ لیکن نیکی کی جو شکلیں محمود حسنی ندوی مرحوم کے یہاں ملتی ہیں، ان کی طرف لوگوں کی نظریں کم ہی جاتی ہیں، نیکی کرنا ہی صرف نیکی نہیں؛ بلکہ کسی کو گنہگار ہونے سے بچالینا بھی ایک بڑی نیکی ہے، نیکی کی اس قسم کی طرف نیکی کرنے والوں کا ذہن کم ہی جاتا ہے؛ بلکہ ہمارے سماج میں شائد اس کو نیکی ہی نہیں سمجھا جاتا، اس کی دو مثالیں میں آپ کو دیتا ہوں۔

جب میرے والد ماجد کا انتقال ہوا تو مجھے اس بات کا خیال نہیں آیا جس بات کا خیال محمود مرحوم کو آیا، انہوں نے لائبریری جا کر یہ معلوم کیا کہ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کے نام سے کوئی کتاب تو نہیں نکلی ہے اور اگر نکلی ہے تو وہ کونسی ہے اور اس کی کیا قیمت ہے، پھر آ کر انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ کے ابی کے نام یہ کتابیں نکلی ہیں، یہ کتابیں تلاش کر کے لائبریری میں جمع کرادیں یا پھر ان کی قیمت ادا کردیں تا کہ آپ کے ابی کے ذمہ حساب باقی نہ رہے۔

اسی طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق شیخ الحدیث مولانا محمد ناصر علی ندویؒ کا جب انتقال ہوا تو محمود کو اس کی فکر ہوئی کہ ان کے نام کتابیں تو نہیں چڑھی ہیں، محمود نے لائبریری جا کر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ فلاں فلاں کتاب مولانا کے نام نکلی ہوئی ہے، محمود نے اپنے چھوٹے بھائی مسعود سے کہا کہ مولانا میرے بھی استاذ تھے اور تمہارے بھی، لہٰذا تم لائبریری جا کر کتابوں کی قیمت جمع کردو، ان کے صاحبزادگان کو بتانے کی ضرورت نہیں، بحیثیت استاذ مولانا کا یہ حق ہم لوگوں پر بھی بنتا ہے۔

ایک واقعہ عین الحسن بھائی کی زبانی سنیے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ مولانا محمود صاحب کے ساتھ خاتون منزل سے ندوہ آرہے تھے، موتی

محل پل کی ڈھال پر ندوہ کے ایک استاد مولانا مظہرالحق کریمی صاحب پیدل ندوہ جارہے تھے، مولانا محمود صاحب نے گاڑی رکوائی، اس سے پہلے کہ میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اترتا، دوسرے دروازہ سے تیزی سے محمود صاحب اتر گئے اور اصرار کرکے مولانا مظہر کریمی صاحب کو اپنی جگہ بٹھایا اور جگہ تنگ ہوجانے کی وجہ سے خود محمود صاحب پیدل ندوہ کی طرف چل دیے، پاؤں میں ورم تھا، کمزوری بھی تھی، میں نے بہت چاہا کہ میں چلا جاؤں، لیکن انہوں نے بڑی سختی سے مجھے روک دیا اور کہا: مجھے بھی کچھ ثواب کما لینے دیجیے۔

گاڑی روک کر کسی کو بٹھانا، کوئی کمال نہیں، لیکن اپنی جگہ دوسرے کو بٹھا کر بیماری کی حالت میں خود پیدل چل دینا بڑی بات ہے، ایثار اور قربانی کے اس طرح کے واقعات اگر ان کے جمع کیے جائیں تو ایک مستقل کتاب تیار ہوجائے، ان کا معاملہ یہ تھا کہ خود تکلیف اٹھا کر اور اپنے کو پریشانی میں ڈال کر دوسروں کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔

غریبوں، ضرورتمندوں، پریشان حال لوگوں کی مالی مدد وہ اس طرح کرتے تھے کہ جیسے وہ ان کی مدد نہیں؛ ان کا قرض ادا کررہے ہیں، لینے والا لے کر شائد اتنا احسان مند نہ بنتا جتنا وہ دے کر احسان مند نظر آتے تھے، ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ گن کر نہیں دیتے تھے، جیب میں ہاتھ ڈالتے اور مٹھی میں جو آجاتا وہ دیدیا کرتے، اپنے لیے کچھ خریدنا، اپنے لیے کچھ کرنا، اپنے لیے کچھ بنانا، ان کو آتا ہی نہیں تھا۔

ایک خصوصیت ان کی یہ بھی تھی کہ آدمی کی ضرورت کو وہ خود ہی بھانپ لیا کرتے تھے اور بغیر اس کے کچھ کہے اپنی بھری مٹھی بڑی خاموشی سے اس کی جیب میں خالی کردیا کرتے تھے، اگر ان کی جیب میں اس وقت دینے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو اپنے بھائیوں سے کہتے یا اپنے ان قریب ترین لوگوں سے کہتے جن کے بارے میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ دے سکتے ہیں اور دے کر خوش بھی ہوتے ہیں اور اس طرح وہ دوسروں کو بھی ایک خیر کے کام میں شریک کرلیتے، وہ خود تو انتہائی خوددار اور غیرت مند تھے؛ لیکن دوسرے کے لیے کسی دوسرے سے کہنے میں وہ ذرا بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے، وہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ اچھائی کا راستہ دکھانے والا ویسا ہی ہے جیسے کہ اچھائی کرنے والا۔

۲۰۱۲ء میں خاندان ہی کے آٹھ افراد پر مشتمل ایک مختصر سا قافلہ حج کو روانہ ہوا، اس قافلہ میں مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی مرحوم، مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی، مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی اور میں بھی تھا اور ہم لوگوں کے گھر والے بھی تھے، محمود مرحوم سب میں چھوٹے تھے، انہوں نے اس موقع پر عبادت اور خدمت کو اس طرح جمع کیا کہ عبادت میں نہ کوئی کمی کی اور نہ خدمت میں کوئی کوتاہی، اس ذوق وشوق سے وہ کام کرتے تھے اور اپنے بڑوں کو ہر طرح کی زحمت سے بچانے کی کوشش کرتے تھے کہ ان کے لیے سب کے دل سے دعا نکلتی تھی، حج کے ایام میں ان کے لیے کی جانے والی یہ دعائیں یقیناً آج ان کے کام آرہی ہوں گی۔

یہ تھیں محمود مرحوم کی وہ خوبیاں جنہوں نے ان کو بلندی اور مقبولیت کے اس مقام پر پہنچادیا تھا جس کا اندازہ لوگوں کو ان کی زندگی میں تو اس طرح نہ ہوسکا لیکن ان کا جنازہ دیکھ کر اور جنازہ کے موقع پر تعلق رکھنے والوں کا ازدحام دیکھ کر لوگوں کو ضرور ہوگیا۔

☆☆☆☆☆

معاملات میں صفائی کی ضرورت

مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ

عقائد درست ہونے کے بعد اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کے بعد سب سے بڑا مسئلہ بندوں کے حقوق کا ہے، یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق معاف فرمادے گا، لیکن اس نے بندوں کو اس بات کا حق دیا ہے کہ وہ اپنے حقوق ومطالبات معاف کریں یا نہ کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: ”جس کے ذمہ اپنے کسی بھائی کا مطالبہ ہو، عزت وناموس کی بات ہو یا کسی اور قسم کی چیز، تو آج ہی اس دنیا میں اس سے صفائی کرلے، اس پہلے کہ جب نہ دینار ہوگا نہ درہم، اگر اس کا کوئی نیک عمل ہوگا تو اس کے بقدر مدعی کے مطالبہ اور حق سے لیا جائے گا اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوگی تو صاحب حق کے گناہ اس مدعیٰ علیہ پر ڈال دیے جائیں گے“۔

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ جانتے ہو کنگال اور خالی ہاتھ کون ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا جس کے پاس نہ نقد ہو نہ سامان، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں مفلس وکنگال وہ ہیں جو قیامت کے دن نماز، روزہ، زکوٰۃ سب لے کر آئے گا لیکن کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا، تو ان کو قیامت میں اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی، جب نیکیاں بھی ختم ہوجائیں گی اور اس پر مطالبے باقی ہوں گے تو اس کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیے جائیں گے، پھر وہ جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ ایسے بڑے خطرہ اور نقصان سے بچنے کے لیے اور اپنا دامن حساب وکتاب سے صاف رکھنے کے لیے ہم کو اپنے معاملات میں صفائی کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

راہِ عمل

دعاۃ ومفکرین کی ذمہ داری

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

اللہ تعالیٰ نے دعوت کی ذمہ داری اس امت پر ڈالی ہے، اور اس کو اس امت کا امتیاز قرار دیا ہے، لیکن اس کے ساتھ حکمت اور بہترین انداز تفہیم کا حکم دیا ہے، اور یہی اسوۂ رسولؐ ہے جس کو صحابہؓ نے اختیار کیا، اور ان کے اسی درد وفکر کا نتیجہ تھا کہ دنیا میں ان کے ذریعہ سے جہاں اسلام پہنچا وہاں کی دنیا بدل گئی، ان کے اخلاق کی بلندی، انسانیت دوستی اور درد ومحبت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے دلوں پر حکمرانی کی، پھر صحابہؓ ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حکمت دعوت کا فریضہ بعد میں آنے والے دعاۃ ومصلحین نے بھی اختیار کیا، یہ بات کہی جاتی ہے کہ حقیقت میں ہندوستان کا فاتح محمود غزنوی نہیں بلکہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہیں، جن کی محبت وعشق الٰہی کی گرمی نے دلوں کو گرمادیا اور ان کے اخلاق کریمانہ کو دیکھ کر لاکھوں لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔

اس وقت حالات کے بگاڑ کا بڑا سبب دعاۃ ومفکرین کا اس اہم ترین پہلو سے صرف نظر کرلینا ہے، جس کا نتیجہ پوری دنیا میں مسلمانوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے، ظاہری اسباب کو سب کچھ سمجھ لینا ایک ایمان والے کے لیے دانش مندی نہیں ہے، اور پھر اسباب کے لحاظ سے بھی جب زمین وآسمان کا فرق ہو تو اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے، تصادم اور فوری انقلاب کی پالیسی کے جو نتائج سامنے آرہے ہیں وہ دنیا کے سامنے ہیں۔

دعوت واصلاح کی تاریخ کا جائزہ لینے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اصول دین میں پورے تصلب کے ساتھ دعوت کے طریقۂ کار میں ہمیشہ تبدیلی ہوتی رہی ہے، نفسیات انسانی اور زمان ومکان کی ہمیشہ اس میں رعایت کی جاتی رہی ہے، اور یہ دعوت کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اگر اس کو نظر انداز کیا گیا تو اس میدان میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ جس طبقہ میں یہ کام انجام دینا ہو اس کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، اس کے حالات وضروریات، ماحول اور تقاضوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے، پھر اسی کی روشنی میں دعوت کا کام انجام دیا جائے، اگر دعوت واصلاح کا کام طبقہ امراء وحکام میں انجام دینا ہے تو اس کے لیے بھی بڑے حزم واحتیاط اور حکمت کی ضرورت ہے، زمان ومکان کے تغیرات کا حالات پر گہرا اثر پڑتا ہے، اور اس کی رعایت دعوت کی بنیادی ضرورت ہے۔

مختلف ادوار کے دعاۃ ومصلحین اور مجددین دین کے حالات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ طریقۂ کار کے جزوی اختلافات اور تغیرات کے باوجود دین کو برسر اقتدار لانے کے دو ہی طریقے اختیار کیے ہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں طریقے اپنی اپنی جگہ بہت اہم اور ضروری ہیں، لیکن ان میں حالات کی رعایت اور ترتیب کا لحاظ غایت درجہ ضروری ہے۔

دین کو اقتدار میں لانے کا سب سے پہلا راستہ جو ترتیب کے لحاظ سے بھی مقدم ہے اور اپنی تاثیر اور افادیت میں بھی اس کو اولیت حاصل ہے، یہ ہے کہ اہل دین دعوت دین کو اس طبقہ میں پہنچائیں جس کے ہاتھ میں زمام اقتدار ہو یا وہ آگے اس کی باگ ڈور سنبھالنے والا ہو، اس کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں اور اس کے لیے مناسب اسلوب اور حکیمانہ طریقہ اختیار کریں۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ براہ راست دیندار حضرات کرسی تک پہنچنے کی کوشش کریں، بلاشبہ یہ دونوں طریقے اپنی اپنی جگہ پر اہم اور مفید ہیں اور بعض حالات میں دوسرا طریقہ بھی اختیار کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ اسی وقت مناسب ہے جب دعوت واصلاح کی امید منقطع ہوجائے اور اصلاح کے لیے انقلاب ہی تنہا ایک راستہ باقی رہ جائے، تاہم عمومی حالات میں دعوت کا سب سے مؤثر طریقہ یہی ہے کہ دین حکام وسلاطین اور امراء کے طبقہ میں پہنچایا جائے، اس کی ذہنی وفکری تربیت کا اہتمام ہو اور ہر ممکن طریقہ پر اس کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا جائے، دعوت واصلاح کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہی طریقہ زیادہ مفید اور کامیاب ثابت ہوا ہے اور اس کے بہترین نتائج سامنے آئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

محاسن اسلام

زبان کا بہتر استعمال اور ہمارا سماج

مولانا سراج الدین ندوی

انسانی اعضاء میں زبان کو بڑی اہمیت حاصل ہے، انسان کی زبان ہی سے اس کی شخصیت اور کردار کا پتہ چلتا ہے، زبان سے انسان کے اندرون کا پتہ چلتا ہے، انسان جو کچھ سوچتا ہے، جو طوفان اس کے دل و دماغ میں اٹھتا ہے اس کا اظہار زبان ہی سے ہوتا ہے، زبان وہ ہتھیار ہے جو دوستی کو دشمنی میں اور دشمنی کو دوستی میں تبدیل کر دیتا ہے، زبان کا بہتر اور اچھا استعمال دلوں کو جوڑتا، سماج میں خوشبو بکھیرتا، دوستی میں گہرائی پیدا کرتا اور دشمنی کو دوستی میں تبدیل کرتا ہے جب کہ زبان کا برا استعمال دلوں کو توڑتا، رشتہ داری کو ختم کرتا، دوستی کو دشمنی میں بدلتا، سماج میں بدبو پیدا کرتا ہے، چنانچہ قرآن پاک میں بار بار اچھی بات کہنے پر زور دیا گیا ہے۔ فرمایا گیا: "قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْناً" [بقرہ:۸۳] (لوگوں سے اچھی بات کہو)۔

ایک دوسری جگہ اللہ نے اپنے رسول کو یہ ہدایت کی کہ وہ تمام بندگانِ خدا کو یہ پیغام دے دیں کہ وہ سب سے اچھی باتیں کہا کریں، ارشاد فرمایا گیا: "وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُولُوا الَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوّاً مُّبِيناً" [بنی اسرائیل:۵۳] (اے (نبیؐ) میرے بندوں سے کہہ دیجیے کہ وہ سب سے اچھی بات کہیں، بے شک شیطان ان کے درمیان جھگڑا کراتا ہے، بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے)۔

دراصل انسان کے مافی الضمیر اور اس کے دل و دماغ میں پلنے والے خیالات کی ترجمانی زبان کرتی ہے، اس لیے زبان بہت سوچ سمجھ کر کھولنی چاہیے، جو کچھ بولنا ہو اسے پہلے تول لینا چاہیے، زبان سے نکلا ہوا تیر پھر واپس نہیں ہوتا اور نہ ہی زبان کے زخم کبھی بھرتے ہیں، کسی شاعر نے کیا خوب کہا تھا:

اگر تلوار کے ہوتے تو کب کے بھر گئے ہوتے
مگر یہ زخم تو دل پر تیری باتوں نے ڈالے ہیں

قرآن پاک اچھی باتیں کرنے کی تلقین کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اچھی باتیں کرنے سے تمہارے حالات اور اعمال سدھر جائیں اور اللہ تمہارے گناہوں کو بھی بخش دے گا، ارشاد ربانی ہے: "وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُّصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ" [الاحزاب:۷۰-۷۱] (درست اور ٹھیک بات کہو اس کے نتیجہ میں اللہ تمہارے اعمال درست کر دے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا)۔

گھر اور سماج میں آئے دن جو جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، اگر اس کے اسباب اور محرکات کا سراغ لگایا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ سب زبان کے غلط اور غیر ذمہ دارانہ استعمال کا نتیجہ ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کی جانب سے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ میری امت زبان کا استعمال کیسے کرے گی، ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا: "یارسولؐ اللہ آپ میرے بارے میں سب سے زیادہ کس چیز سے ڈرتے ہیں؟" آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں اپنی زبان مبارک کو پکڑتے ہوئے فرمایا: "اس کا ڈر ہے"۔

اسی لیے آپؐ نے زبان کے درست استعمال پر جنت کی ضمانت دی ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص اپنی زبان اور شرمگاہ کی ضمانت دے میں اس کے لیے جنت کی ضمانت لیتا ہوں"۔ [صحیح بخاری]

ایک بار آپؐ نے جنت کا ذکر فرمایا، اس کی خوبیوں اور وسعتوں کو بیان کیا، ایک صحابیؓ نے بیتابانہ عرض کیا: "یارسولؐ اللہ! یہ جنت کس کو ملے گی"؟ آپؐ نے فرمایا: "جس شخص نے اچھی باتیں کیں، بھوکوں کو کھانا کھلایا، اکثر روزے رکھے اور اس وقت نماز پڑھی جب دنیا سوتی ہے"۔ [جامع ترمذی]

زبان سے اچھی بات نکالیے یا خاموش رہیے، کیوں کہ مومن کی زبان سے خیر اور بھلائی کی بات نکلتی ہے، اس کی زبان سے نہ کوئی بری بات نکلتی ہے، نہ وہ کسی کو طعنہ دیتا ہے، نہ کسی کو عار دلاتا ہے، نہ کوئی ایسی بات کہتا ہے جس سے دوسرے کے دل کو ٹھیس پہنچے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو اللہ اور آخرت پر یقین رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ اچھی بات کہے ورنہ خاموش رہے"۔ [صحیح مسلم]

پیارے نبیؐ نے فرمایا: "مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے، نہ کسی پر لعنت بھیجتا ہے، نہ بدزبانی کرتا ہے اور نہ فحش کلامی کرتا ہے"۔ [جامع ترمذی]

ایک دفعہ آپؐ نے بار بار جہنم کا ذکر فرمایا یہاں تک کہ چہرہ انور اس کی تکلیفوں کے تصور سے متغیر ہو گیا پھر ارشاد فرمایا: "جہنم سے بچو چاہے چھوارے کے ایک ٹکڑے کے صدقے کے ذریعہ ہو، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اچھی بات کے ذریعہ"۔ [صحیح بخاری]

حضرت عقبہؓ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی

اور آپ ؐ سے عرض کیا کہ مجھے نجات حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟ آپ ؐ نے فرمایا: ’’اپنی زبان پر قابو رکھو‘‘۔ [جامع ترمذی]

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا گھر اور سماج امن کا گہوارہ بنا رہے یا آپ آخرت میں جہنم سے بچ سکیں اور جنت میں آپ کا داخلہ ہو سکے تو اپنی زبان کو قابو میں رکھئے، اس سے اچھی بات کہیے ورنہ خاموش رہیے، بری بات کہنے سے خاموش رہنا بہتر ہے اور خاموش رہنے سے اچھی بات کہنا بہتر ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام اعضاء زبان کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں، زبان کے اثرات و نتائج انسان کے تمام اعضاء پر پڑتے ہیں، اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس کے تمام اعضاء صحیح و سلامت رہیں اور ان سے اچھے عمل صادر ہوں تو اسے چاہیے کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھے، حضرت ابوسعیدؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ؐ نے فرمایا: ’’جب انسان صبح کرتا ہے تو اس کے سارے اعضاء عاجزی کے ساتھ زبان سے کہتے ہیں کہ ہمارے سلسلہ میں اللہ سے ڈر! کیونکہ ہم تیرے ساتھ بندھے ہوئے ہیں تو ٹھیک رہی تو ہم ٹھیک رہیں گے، اگر تو ٹیڑھی رہی تو ہم بھی سیدھے نہ رہ سکیں گے‘‘۔ [جامع ترمذی]

اگر کبھی تم سے بیہودہ اور اجڈ لوگ الجھنا چاہیں تو ہم ان سے معذرت کرلیں اور کہیں کہ یہ رویہ تمہیں مبارک ہو، ہم کوئی بیہودہ اور لغویات نہ کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی ایسے لوگوں کا ساتھ دے سکتے ہیں اور نہ ان سے الجھ سکتے ہیں، کیونکہ ہمیں اسلام نے شریفانہ بات کرنے اور اچھا رویہ اپنانے کی تلقین کی ہے، قرآن کریم نے اللہ کے محبوب بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ’’وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا‘‘ [الفرقان: ۶۳] ’’وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا‘‘ [الفرقان: ۷۲] (اور جب اجڈ لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ کہتے ہیں ’سلام بھائی اور جب ان کا گزر بیہودہ لوگوں کے پاس سے ہوتا ہے تو وہ شریفانہ طور پر وہاں سے گزر جاتے ہیں)۔

اس سلسلہ میں سیرت میں ہمیں بڑا نصیحت آموز واقعہ پڑھنے کو ملتا ہے:

ایک بار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، ایک یہودی آیا، اس نے بدتمیزی کی باتیں شروع کردیں، آپ ؐ دونوں خاموش بیٹھے رہے، وہ اول فول بکتا رہا، حضرت ابوبکرؓ نے زبان کھولی اور اس کو جواب دینا چاہا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر چلے گئے، اگلے دن جب حضرت ابوبکرؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تو شکایت کے انداز میں بولے: ’’اے اللہ کے رسولؐ! وہ دشمنِ خدا ہمیں برا بھلا کہتا رہا، جب میں نے اسے جواب دینا چاہا تو آپ ؐ اٹھ کر چلے آئے، آپ ؐ کو میری حمایت کرنا چاہیے تھی؟ آپ ؐ نے فرمایا: ’’اے ابوبکرؓ! جب تک وہ اول فول بکتا رہا تو رحمت کے فرشتے ہمارے لیے دعا کرتے رہے؟ جب تم نے جواب دینے کے لیے زبان کھولی تو رحمت کے فرشتے وہاں سے چلے گئے، پھر میں وہاں کیا کرتا‘‘۔

مختصر یہ کہ ہمیں چاہیے کہ زبان کھولنے سے پہلے خوب سوچ سمجھ لیں، زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکالیں جو غلط یا تکلیف دہ ہو، جس سے گھر یا معاشرہ میں غلط پیغام جاتا ہو، ہمیشہ ایسی بات زبان سے نکالیں جو گھر اور معاشرہ کے ماحول کو خوشگوار بنائے تاکہ ہماری دنیوی زندگی بھی سکون و آرام سے گزرے اور ہمیں آخرت میں بھی جنت میں جگہ مل سکے۔

☆☆☆☆☆

ذرائع ابلاغ کے مفید استعمال کی ضرورت

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اسلامی قانون کے ماہرین نے لکھا ہے کہ اگر آپ کے پڑوسی کا مکان نیچا ہے، آپ اس کے مقابلہ میں اونچی عمارت بناتے ہیں اور اس سے پڑوسی کے گھر میں بے پردگی ہوتی ہے تو آپ کے لیے بے پردگی سے بچاؤ کا انتظام کیے بغیر اونچا مکان بنانا جائز نہیں ہے اور حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ آپ کو ایسے مکان کی تعمیر سے منع کردے، یہ نسبۃً تو معمولی مضرت ہے، لیکن انٹرنیٹ کے پروگرام سے نقصان پہنچتا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اس لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ ایسے پروگراموں کی روک تھام کے لیے مؤثر کوشش کرے تاکہ ہماری نسل بے راہ روی میں پڑنے سے محفوظ رہے اور ملک کی اخلاقی قدریں محفوظ رہیں۔

موجودہ حالات میں جب کہ ایسے ذرائع زندگی کی ضرورت بنتے جارہے ہیں اور اسے یک قلم روک دینا ممکن نہیں، اس بات کی ضرورت ہے کہ ان ذرائع کو زیادہ سے زیادہ خیر کے کام اور نیکی کے پیغام کے لیے استعمال کیا جائے، دینی ادارے، مذہبی تنظیمیں اور دینی و علمی شخصیتیں اس میدان میں آگے بڑھیں، اگر کسی راستہ میں کانٹے بچھانے والے موجود ہوں، پھول رکھنے والے موجود نہ ہوں تو جو لوگ اس رہ گزر سے گزرنے پر مجبور ہوں، وہ تو بہرحال گذریں گے، لیکن اس طرح کہ ان کے قدم لہولہان ہوں گے، ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اپنے سماج کو اس صورتحال سے بچائیں اور بگاڑ کے خارزار کے درمیان بہتر تعلیمات کے پھول بچھانے کی کوشش کریں۔ ☆☆☆

صحبتے با اہل دل

دلوں پر قرآنی آیات کے اثرات

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کے مجلسی افادات

ترتیب وپیشکش: محمد سلمان بجنوری ندوی

قرآن کریم اللہ تعالی کا پاک کلام اور اس کی عظیم کتاب ہے، اس میں اللہ رب العزت نے عجیب وغریب تاثیر رکھی ہے، انسان اس کی حقیقی طاقت سے واقف نہیں ہے، انسان کیا وہ مسلمان جو اس کو پڑھتا ہے، نماز میں اس کی تلاوت کرتا ہے، وہی اس کی قوت سے نا واقف ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس کلام میں بے پناہ طاقت ہے، اس کی ایک ایک آیت اپنے اندر عجیب تاثیر اور کشش رکھتی ہے، اس کی مثال اس طرح سمجھیے کہ بجلی کا تار آپ نے دیکھا ہوگا اس پر پلاسٹک چڑھی ہوتی ہے، اب اس میں کتنی ہائی پاور کی بجلی دوڑ رہی ہے کوئی اندازہ نہیں کرسکتا، اگر آپ نے پلاسٹک کے اوپر سے تار پکڑا ہے تو آپ کو احساس تک نہیں ہوگا کہ اس کے اندر جو تار ہے اس میں کتنی بجلی دوڑ رہی ہے، بالکل اسی طرح قرآن پاک میں تاثیر ہے ہم لوگ ظاہری طور پر تلاوت کرلیتے ہیں اس میں جو معانی و مطالب کا ذخیرہ موجود ہے اور اس کے علوم کا جو ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے اس سے ہم ناواقف ہیں، اس لیے اس کی تاثیر اور اس کے کرنٹ کا ہمیں اندازہ ہی نہیں۔

ہم ہندوستانی مسلمانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم عربی زبان سے بالکل نابلد ہیں، اس کی فصاحت و بلاغت اور باریکیوں کی تو بات ہی کیا ہے، اس لیے ہمارے اوپر قرآن پاک کے پڑھنے اور سننے سے کوئی اثر ہی نہیں پڑتا، ورنہ آپ دیکھیں گے مکی دور میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے اور کفار ومشرکین سنتے تھے تو ان کے دلوں کی حالت تبدیل ہوجاتی تھی، کتنے صحابہ ہیں جو قرآن پاک کو سن کر اسلام میں داخل ہوئے اور جو سنتا وہ یہی کہتا کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا کتنا مشہور واقعہ ہے، حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ ان کی بہن حضرت فاطمہ اور بہنوئی حضرت سعید بن زید کو قرآن پاک سکھا رہے تھے، جب حضرت عمر گھر پہنچے تو حضرت خباب گھر میں چھپ گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ تشدد کیا، پھر جب تھوڑا نرم پڑے تو کہا کہ مجھے بھی دکھاؤ کیا پڑھ رہے تھے، پھر جب سورہ طہ کی آیات پڑھیں تو دل کی کیفیت ہی بدل گئی پھر عمر وہ عمر نہ رہے جو پہلے تھے، اتنے میں حضرت خباب رضی اللہ عنہ باہر آتے ہیں اور ان کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جاکر مشرف بااسلام ہوجاتے ہیں۔

حضرت طفیل بن عمرو دوسی کا واقعہ پڑھ لیجیے، جب یہ مکہ پہنچے تو کفار نے اسلام اور نبی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان کے ذہن کو اتنا پراگندہ کردیا اور اتنا ان کو بدظن کردیا کہ انہوں نے ارادہ کرلیا کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ ملاقات کروں گا نہ ان کا کلام سنوں گا اور اپنے کان میں روئی ٹھوس لی کہ کوئی آواز کان میں نہ پڑے، لیکن انہوں نے اپنے آپ سے کہا کہ تو اتنا اچھا شاعر ہے، کلام عرب سے واقف ہے، زبان وادب کی باریکیاں سمجھتا ہے، ڈرکس بات کا ہے کوئی اچھی بات ہوگی تو قبول کرلینا اور اگر کوئی بری بات ہوگی تو چھوڑ دینا، پھر جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پاک کو سنا تو ان کی دنیا ہی بدل گئی، اسی لیے کفار کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں پر جادو کردیتے ہیں، لیکن یہ جادو نہیں بلکہ کلام اللہ کی تاثیر اور اہل مکہ کا عربی زبان سے واقف ہونا تھا اور بھی بہت سے واقعات ہیں جو قرآن پاک کی قوت تاثیر پر دلالت کرتے ہیں۔

ہمارا تمام دینی سرمایہ عربی زبان میں ہے، اگر ہم عربی زبان نہیں سیکھتے ہیں تو ہم براہِ راست عربی مصادر ومراجع سے استفادہ نہیں کرسکتے، گو ہم کسی دوسری زبان کے ذریعہ ان مصادر سے فائدہ اٹھالیں اور ہمارے دین کا منبع اور سرچشمہ قرآن پاک اور احادیث نبویہ ہیں اور یہ دونوں ہی عربی زبان میں ہیں، ہر مسلمان کو اتنی عربی تو آنی ہی چاہیے کہ نماز میں جو تلاوت کرے اس کو سمجھے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں میں اپنے رب سے کیا بات کررہا ہوں۔

☆☆☆☆☆

تاریخ ہند

بی اماں- جن کو ہم نے بھلادیا

نام نیک رفتگاں ضائع مکن

نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی

وطن عزیز کو برطانوی قبضے سے آزاد کرانے میں مسلمانوں خصوصاً علمائے کرام نے جس جذبے ،ولولے اور جوش وخروش سے حصہ لیا، وہ بلاشبہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ ان لائق صدفخر علمائے کرام کی برپا کی ہوئی تحریک خلافت ہی نے غاصب انگریزوں کو مجبور کیا کہ وہ اس ملک کو اپنے ناجائز قبضے اور بے جا تسلط سے آزاد کریں۔

تحریکِ خلافت نے اسلامیانِ ہند کو اتنی ہمت اور حوصلہ بخشا کہ وہ اپنے باہمی اختلافات بھلا کر حصول آزادی کے لیے متحد ہوجائیں۔ شمعِ آزادی کے ان پروانوں کے دوش بہ دوش پردہ نشین مسلم خواتین بھی تھیں،اسی شرعی پردے میں جس کو اس وقت بھی ''قدامت پرستی'' اور''دقیانوسیت'' کی علامت سمجھا جاتا تھا اور آج بھی جلوۂ فرنگ اور تہذیب مغرب کی وقتی چکا چوند سے متاثر افراد اس کو نام نہاد ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھ رہے ہیں، لیکن بدقسمتی سے تحریک خلافت اور جدو جہد آزادی کی تاریخ میں ان کے نام اور ان کی خدمات کو یا تو فراموش کردیا گیا یا پھر سرسری طور پر ان کا تذکرہ کیا گیا ہے،ان فراموش شدہ خواتین اسلام میں سے ایک اہم اور نمایاں نام بی اماں کا بھی ہے، حالاں کہ اس خدا رسیدہ خاتون کی حیات اور خدمات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے کارنامے اس درجے کے ہیں کہ ان کو ''مادرِ ملت'' کا لقب دینا چاہیے اور ان کی شایانِ شان یادگار قائم کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

بیسویں صدی مسیحی کی دوسری اور تیسری دہائی میں وطن عزیز کے ملی وقومی مطلع پر روشن ہونے والی اس خاتون کا اصل نام آبادی بانو بیگم تھا، لیکن انہوں نے 'بی اماں' کے نام سے ملک گیر شہرت پائی،ان کی ولادت ۱۸۵۲ء کے آس پاس امروہہ کے ایک باحمیت اور غیرت مند مسلم گھرانے میں ہوئی۔ والد ماجد کا نام مظفر علی خاں تھا، وہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نام ور جاں باز ومجاہد تھے،شوہر کا نام عبدالعلی خاں تھا، ان کا انتقال ۱۷؍رمضان ۱۲۹۷ھ مطابق ۲؍اگست ۱۸۸۰ء کو ہوا، اس طرح بی اماں محض ۲۷، ۲۸؍ برس کی عمر میں بیوہ ہوگئی تھیں، اولاد میں پانچ صاحب زادے اور ایک صاحب زادی تھیں، دو صاحب زادے مولانا شوکت علی (متوفی ۱۹۳۸ء) اور مولانا محمد علی جوہر (متوفی ۱۹۳۱ء) بہت مشہور ہوئے۔

بی اماں انتہائی پردہ نشیں خاتون تھیں، انہوں نے اپنی اولاد کو دین،علم، ادب اور تہذیب کی دولت سے مالامال کیا، اگرچہ اس سلسلے میں ان کو مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے پاکیزہ ارادوں پر قائم رہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے لختِ جگر اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے ملک وملت کی خدمت کریں۔ انہوں نے اپنی جوانی کے زمانے میں حج کے موقع پر غلاف کعبہ پکڑ کر اپنی اولاد کے حق میں یہ دعا نہیں کی تھی کہ انہیں دنیوی شان وشوکت اور اعلیٰ مراتب ومناصب حاصل ہوں بلکہ انہوں نے رب کعبہ سے یہ دعا کی تھی: ''اے پروردگار! میری اولاد کو دین کا سچا خادم اور پختہ مومن بنادے۔'' رب کعبہ نے درِ کعبہ پر کھڑی اس نیک طینت سائلہ کو مایوس نہیں کیا اور مولانا محمد علی جوہر کی صورت میں اسلامیانِ ہند کو ایک ایسا زعیم عنایت کیا جو اعلیٰ مومنانہ اور مجاہدانہ صفات سے متصف ہونے کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں بہت ممتاز تھا۔

بی اماں میں ملی غیرت، ایمانی حرارت، دینی حمیت، اسلامی حمایت اور مسلمانوں سے محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ نہایت عبادت گزار، نماز روزے خصوصاً نماز تہجد کی بہت پابند تھیں۔ ان کی نماز فجر سفروں کی کثرت اور رات کی تقریروں اور جلسوں میں شرکت کے باوجود پچاس برس کی مدت میں کبھی قضا نہیں ہوئی۔ تحریک خلافت کے سنہرے دور میں بی اماں خود بھی شعلہ جوالہ بن کر رہیں۔ انہوں نے گرمی محفل کو برقرار رکھنے کے لیے دور دراز کے پرمشقت اور پرصعوبت سفر کیے، ان سفروں میں وہ اسلام اور اسلامی خلافت کی حمایت وتائید میں نہایت مؤثر اور دل آویز تقریریں کرتی تھیں۔

''بی اماں نے ۳۰؍دسمبر ۱۹۱۷ء کو کلکتہ کے اجلاس مسلم لیگ میں جو پیغام دیا وہ 'تاریخ دعوت وعزیمت' میں جلی حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے، اس پیغام کی ایک ایک سطر سے عزم، ہمت، جوش، ولولہ اور استقلال واستقامت کی داستانیں ترتیب دی جاسکتی ہیں، وہ کہتی ہیں:

''یہ پیغام نہ میری ذات سے وابستہ ہے اور نہ اسلام کے ان دو خادموں کی ذات سے جن کو خدا نے امانتاً میرے سپرد کیا ہے اور جنھوں نے

میری گود میں پرورش پائی.....اگرچہ اس ضعیف اور سن رسیدہ سی عورت کا جسم خاکی اب فرسودہ اور کم زور ہوگیا ہے لیکن دل اور دل کے اندر اتنا کم زور نہیں کہ شوکت علی اور محمد علی کو وہ جادۂ حق سے ایک قدم باہر جانے کی اجازت دے دے، اس سے قبل کہ وہ صراط مستقیم سے ہٹ سکیں، انہی ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی، آج اس جگہ اپنے ہندو بھائیوں اور عزیزوں کو دیکھ کر میرے دل میں باوجود غم کے خوشی کی لہر اٹھتی ہے مگر وہ لہر شکوہ وشکایت کی آمیزش سے پاک ہے۔'' [شنیدہ ودیدہ، از پروفیسر اختر الواسع، ص:۶۹، ۷۰]

گاندھی جی (متوفی ۱۹۴۸ء) نے ''ینگ انڈیا'' میں ان کی استقامت اور استقلال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

''اگرچہ سن رسیدہ تھی لیکن ان میں نوجوان جیسی طاقت تھی۔ انہوں نے خلافت اور سوراجیہ کے حصول کے لیے مسلسل سفر کیے۔ وہ اسلام کی کٹر پیرو تھیں اور اس کے کاز کو ہندوستان کی آزادی پر منحصر سمجھتی تھیں اور ہندوستان کی آزادی ان کے نزدیک کھدر اور ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ناممکن تھی، اسی لیے انہوں نے اتحاد کے لیے زبردست کوششیں کیں جو ان کے نزدیک جزو ایمان تھیں''۔ [حوالہ بالا، ص:۷۱، ۷۲]

نومبر ۱۹۲۱ء میں بی اماں کے جگر پاروں اور مسلمانانِ ہند کے محبوب قائدین مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر کو فرنگی حکومت نے اپنے غاصبانہ اقتدار کے لیے خطرہ سمجھ کر کراچی میں دو برس کی قید بامشقت کی سزا دی۔ اس وقت بی اماں کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہوئی نظم ''صدائے خاتون'' کے نام سے بہت مشہور ہوئی۔ اس نظم کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحاں میں اترنا
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے
کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دین احمد کے رستے
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
حشر میں حشر برپا کروں گی
پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعویٰ کروں گی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

[ملاحظہ ہو ص:۱۰۸، باب ۱۵، محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق، از مولانا عبدالماجد دریابادیؒ]

مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر جب چھندواڑے کے قید خانے میں بند تھے، اس وقت یہ خبر مشہور ہوئی کہ حکومت کسی ذریعے سے معافی نامے کا ایک مسودہ دونوں بھائیوں کے پاس بھیج کر ان کے دست خط کرانا چاہتی ہے۔ بی اماں کو جب یہ اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے جگر پاروں کے پاس کہلا بھیجا کہ: ''اگر کسی بھی معافی نامے پر دست خط کا تم لوگوں نے ارادہ کیا تو قبل اس کے کہ دست خط کر سکو اپنے ان ہی بوڑھے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دوں گی۔'' اس شیر دل ماں کی اولاد اگر شیر نہ ہوتی تو کیا ہوتی؟

اس وقت بی اماں نے فخر سے کہا تھا:

''یہ عزت (قید) ان لوگوں کے لیے ہے جن کو خدا اپنے مذہب اور اپنے ملک کی خاطر تکلیفیں برداشت کرنے کی طاقت دیتا ہے''۔

بی اماں نے قومی اتحاد اور تحریک ترک موالات میں اپنا کردار بہ طریق احسن نبھایا۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۱۷ء کو انہوں نے کلکتہ اجلاس میں شرکت کی اور ۲۴ راگست ۱۹۲۲ء کو انبالہ کے اجلاس میں شریک ہوئیں۔

بی اماں نے اپنے اخلاص، عزم، حوصلے، استقلال، کردار اور عمل پیہم سے اپنے نام ور فرزندوں کی رگ وپے میں بجلیاں بھر دی تھیں۔

مادر محترم کی اس تربیت کا اثر تھا کہ ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس لندن میں برطانیہ کے بادشاہ کے روبرو رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے کلمہ حق کہا اور بہترین جہاد کیا۔

مولانا محمد علی نے اپنی والدہ ماجدہ کے لیے لکھا ہے: ''میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے مجھے اسی مرحومہ کے ذریعے سے پہنچایا ہے۔''

مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی (متوفی ۱۹۲۶ء) جو مولانا عبدالماجد دریابادی (متوفی ۱۹۷۷ء) کے ساتھ ہفتہ وار 'سچ' لکھنؤ کی مجلس ادارت میں شریک تھے، بی اماں کے متعلق اپنے مشاہدات وتاثرات کا اظہار ایک مضمون میں یوں کرتے ہیں:

''۲۱ رفروری ۱۹۲۲ء کی صبح کو کارکنان خلافت کمیٹی نے مولانا آزاد کے دولت خانہ پر بی اماں کی خدمت میں حاضری دی، کارکنان کی عنایت اور مہربانی سے طفیلیوں کے طور پر میں نے بھی شرف باریابی حاصل کیا، میں ابتدا سے انتہا تک سکوت اور خاموشی کے عالم میں رہا اور میرا دل اندر ہی اندر قدیم ہندوستانی شرفاء کی تربیت، ان کی مذہبی عقیدت اور خدا اور رسولؐ

کے نام پر ان کی شیفتگی اور پختگی و استقلال کے افسانے یاد کر رہا تھا۔

دوران گفتگو میں انھوں نے زیادہ تر پُرانے طریقوں کو اختیار کرنے پر زور دیا اور فرمایا، شوکت محمد کو میں برابر تعلیم کے زمانہ میں وضع قطع، تراش خراش میں پرانی روش کو نہ چھوڑنے کے لیے کہتی رہی لیکن اس زمانے میں کچھ ہوا ایسی چلی کہ انھوں نے میری بات پر کان نہ دھرا، اب الحمد للہ کہ وہ راہِ راست پر آگئے۔ قدیم زمانے کی بوڑھی اور سیدھی عورتوں کی طرح انگریزی حکومت کو وہ نئی تراش کے لفظوں سے کم یاد کرتی ہیں اور زیادہ تر فرنگی کا لفظ استعمال کرتی ہیں۔ اس جملہ کو انھوں نے کئی بار دُہرایا کہ میرے بھائیو! فرنگی چال چلن کو خیر باد کہو، اپنے بزرگوں کا رویہ اختیار کرو، اسی سلسلہ میں انھوں نے فرمایا کہ جب غدر کے بعد لوگ فرنگیوں کی طرف جھکے اور ان کے چال چلن اختیار کرنے لگے تو اگلے زمانے دیکھے ہوئے کہا کرتے تھے کہ ان کی نوکریوں کو قبول نہ کرو، ان لوگوں کو نصرانیوں کی باتوں پر اعتبار نہ تھا، چنانچہ میری پرنانی فرمایا کرتی تھیں کہ فرنگیوں کے انعام نہ لو، یہ ان کی چال ہے۔

علی برادران کا ذکر آجانے پر بی اماں نے ان دونوں بھائیوں کی خدمت کا انکسار اور عاجزی کے لہجے میں ذکر کیا اور فرمایا کہ اس وقت وہ دونوں بھائی جیل میں جو مصیبتیں اٹھا رہے ہیں وہ اسلام کی راہ میں بہت ہی کم ہیں، ہمارے پیغمبر صاحبؐ کو تو بڑی بڑی تکلیفیں ہوئیں، انھوں نے بڑی عقیدت سے بیان کیا کہ آج شوکت محمد جو کر رہے ہیں وہ خدا کی خاص عنایت و مہربانی ہے۔

بی اماں نے تمام تر گفتگو انتہائی سنجیدگی و متانت سے فرمائی، لیکن جب خلافت اور مسلمانوں کی تباہی کا ذکر نے لگیں تو میں نے دیکھا کہ جوش کی وجہ سے ان کے بوڑھے اور لاغر ہاتھ کانپنے لگے تھے اور ان کے چہرے پر غم و غصہ کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔

فرمانے لگیں کہ جب شوکت محمد گرفتار ہو گئے تو میں بُڑھیا اپاہج جس کو چارپائی سے اُٹھنا دشوار تھا، کراچی جانے کو تیار ہوگئی، کراچی میں میں نے شوکت سے کہا کہ بیٹا میں کسی قابل نہیں لیکن اگر تم لوگوں کے طفیل سے اس آخری عمر میں کچھ خدمت اسلام ہو سکے تو بڑی خوش نصیبی ہے، فرمایا کہ میں نے اپنا کفن تیار کر کے اپنے ساتھ رکھ لیا ہے اور اشفاق (شوکت علی صاحب کے سکریٹری) سے کہہ دیا ہے کہ عمر کا کیا ٹھکانا ہے، سفر میں موت آجائے تو میرے مسلمان بھائیوں سے دو گز زمین مانگ کر مجھے دفنا دینا۔

انھوں نے نیکی کے پھیلانے پر خاص طور سے نصیحت کی اور کہا کہ انسان دو بادشاہوں کے جھگڑے میں ہے، ایک بادشاہ روح اور عقل وزیر ہے اور دوسرا بادشاہ نفس ہے اور دل اس کا وزیر ہے۔ جس نے نفس کی اطاعت کی وہ گمراہ ہوا، اور جس نے روح کا کہنا مانا وہ سیدھے راستہ پر چلا۔ بی اماں کے اس جملے نے جسے اغلباً انھوں نے اپنے کسی بڑے بوڑھے یا صالح اور متقی انسان سے سنا ہے میرے اوپر روحانی سبق کا دروازہ کھول دیا اور میرے دل کو ایک غلط فہمی سے نکال لیا جس میں نسل جدید کے بہت سے لوگ گرفتار ہیں۔

موجودہ مظالم اور سختیوں کے متعلق فرمانے لگیں کہ لوگوں کو چھوڑ دو، وہ جس قدر چاہیں مظالم میں چڑھ جائیں جو جتنا بلند چڑھتا ہے اتنا ہی زور سے گرتا اور چوٹ بھی زیادہ کھاتا ہے، عدم تشدد کے بارے میں فرمایا کہ ہم لوگ کمزور اور وہ زبردست، اگرچہ میں اس کو زبردست نہیں مانتی، زبردست تو صرف اللہ ہے لیکن دنیا عالم اسباب ہے اس لیے ہمیں یہی کرنا چاہیے۔

بی اماں کی خدمت میں میری حاضری کا یہ پہلا اتفاق تھا اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ علی برادران کے اخلاق و عادات اور ان کے مضبوط کیریکٹر پر جس قدر بی اماں کی خوش سلیقہ تربیت کا اثر ہے غالباً وہ کسی کے اس قدر منت پذیر نہیں ہیں۔ اس قسم کی باتیں اب ہمارے اندر مفقود ہیں، کاش اس زمانے کی عورتیں بی اماں کو دیکھیں اور ان کے جیسے عقائد و خیالات اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر علی برادران کے ساتھ وہ معاملہ کیا جاتا جو عبداللہ بن زبیرؓ کے ساتھ کیا گیا تو بی اماں اپنے صبر و استقلال میں حضرت اسماءؓ، والدہ ابن زبیرؓ کی سنت زندہ کرتیں۔

اس قسم کے خیالات ہمارے ملک کے شریف خاندانوں میں اکثر پائے جاتے تھے لیکن اب ہم میں وہ رسم و آئین کہن کہاں، ایک بی اماں کو دیکھ کر یاد آجاتا ہے:

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را"

(ملاحظہ ہو ماہ نامہ 'رضوان' لکھنؤ، اگست ۱۹۶۳ء باختصار)

۱۲، ۱۳/ نومبر ۱۹۲۴ء بدھ، جمعرات کی درمیانی شب میں تقریباً ۷۲ برس کی عمر میں اس بزرگ خاتون کا انتقال ہوا اور درگاہ شاہ ابوالخیر، دہلی میں دفن ہوئیں۔

مادر ملت بی اماں کے قول و فعل، کردار اور عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدائے رحمٰن و رحیم کی بندیاں، رحمۃ للعالمینؐ کی باندیاں، امہات المومنینؓ اور بنات طاہراتؓ کے ناموں پر مر مٹنے والیاں اس دور ظلمت میں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

علوم وفنون

سائنس کے میدان میں مسلمانوں کی خدمات

عبید الرحمٰن ندوی

یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اسلام ترقی اور فروغ کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں رہا ہے، تاریخ دنیا کے دیگر مذاہب کی سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں اہم کردار ادا کرنے کی ایک بھی مثال نہیں پیش کرسکتی ہے جیسا کہ اسلام نے ادا کیا ہے، بیسویں صدی کے معروف عالم دین مفکر اسلام مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کے الفاظ میں: ''یورپی احیاء کا کوئی واحد گوشہ نہیں ہے جو اسلامی فکر کا مقروض نہ ہو، اسلام نے یورپ کو ایک نئی زندگی دی ہے''۔

محمد اسد نے اپنی کتاب ''Islam at the Crossroads'' میں بالکل صحیح کہا ہے کہ: ''تاریخ بغیر کسی شک کے امکان کے یہ ثابت کرتی ہے کہ کسی مذہب نے سائنسی ترقی کو اتنی ترغیب نہیں دی ہے جتنی کہ اسلام نے دی ہے، تعلیم اور سائنسی تحقیق کو جو حوصلہ افزائی دین اسلام سے ملی اسی کے نتیجہ میں عہد بنی امیہ، عہد عباسی اور عربوں کے اندلس میں دور حکومت کے دوران شاندار ثقافتی کامیابیاں حاصل ہوئیں، یورپ کو یہ اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ یہ اسلام کا اتنا ہی مقروض ہے جتنا کہ صدیوں کی تاریکی کے بعد نشأۃ ثانیہ کا۔ میں اس کا ذکر اس لئے نہیں کررہا ہوں کہ ہم خود پر فخر کریں ان شاندار یادوں میں کھو کر ایک ایسے وقت جب عالم اسلام نے اپنی سنت بھلا رکھی ہو اور اندھے پن اور ذہنی افلاس کا شکار ہو چکا ہو، ہمیں حق نہیں حاصل ہے کہ اپنی موجودہ بدبختی کے ساتھ ماضی کے کارناموں پر فخر کریں، بلکہ ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ یہ مسلمانوں کی غفلت تھی نہ کہ اسلامی تعلیمات میں کوئی کمی تھی جو موجودہ بربادی کا سبب بنا۔

انہیں خیالات کا اظہار حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بھی کیا ہے: ''قرون وسطیٰ میں جب یورپ تاریکی اور جہالت کے دور سے گزر رہا تھا مسلم دنیا میں علماء، مفکرین، ماہر تعلیمات اور طبعی اور سماجی علوم کے ممتاز اساتذہ پیدا ہو رہے تھے۔ یورپی مصنفین نے بسا اوقات اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ یورپ نے ترقی کی راہ پر قدم بڑھانے سے قبل چھ سو سالوں تک مسلمانوں کی تحقیقات کو سیکھا اور اس سے استفادہ کیا ہے، Marquis کے الفاظ میں: ''یہ مسلمانوں کا ہی علم تھا، مسلمانوں کا ہی فن تھا اور مسلمانوں کا ہی ادب تھا کہ جس کا یورپ بڑی حد تک مقروض ہے قرون وسطی کی تاریکی سے نجات حاصل کرنے میں''۔

ڈاکٹر رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) نے بالکل صحیح بیان کیا ہے کہ یورپ میں سائنس کی نشوونما تحقیق کے نئے جذبے، تفتیش کے نئے طریق کار، تجرباتی طریق کار، مشاہدہ، پیمائش، ریاضی کا فروغ ایک ایسی شکل میں جو یونانیوں کے لئے غیر معروف تھا کے نتیجے میں ہوئی۔ اور وہ جذبہ اور وہ طریق کار یورپی دنیا میں عربوں (مسلمانوں) کے ذریعہ متعارف ہوئی تھی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلام کی آمد سے پہلے علم کی بنیاد ارسطو کے استخراجی طریقے (Deductive Method) پر تھی۔ یہ واضح رہے کہ استخراجی طریقہ کسی نئے علم کا تصور پیش نہیں کرتا بلکہ یہ پرانی چیز کی تصدیق کا تصور پیش کرتا ہے۔ یہ انسان کو دوسرے پر بھروسہ کرنے والا بنا دیتا ہے۔ جبکہ اس کے برخلاف اسلام نے استقرائی طریقہ (Inductive Method) کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ وہ طریقۂ تصور ہے جو نئے نئے علوم کا راستہ دکھاتا ہے اور نئی تحقیق وجستجو کی طرف گامزن کرتا ہے، یہ وہی نقطۂ نظر اور طریقۂ کار ہے جس سے سائنس کے سفر کا آغاز ہوتا ہے اور بعد میں یہی استقرائی طریقہ غیر معمولی علمی اور سائنسی ارتقاء کے لیے بہت زیادہ مدد ومعاون ثابت ہوا ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مسلمان سائنسدانوں نے نہ کہ صرف سائنس کی حقیقی خدمت کی بلکہ ٹکنالوجی کی بھی کی۔ دیگر الفاظ میں، انہوں نے اپنی سائنسی تحقیقات کا عملاً استعمال کیا، انہوں نے ستاروں کا مشاہدہ کیا، اور جہاز رانی کے لیے کوہی نقشے بنائے، ابن یونس نے وقت پیمائی کے لئے پنڈولم کا استعمال کیا، ابن سینا نے ہوائی تپش، کاغذ، قطب نما، بندوق، بارود، مسلمان سائنسدانوں کی سائنسی اور تکنیکی ترقیوں کے غیر نامیاتی نظائر جس نے انسانی تمدن میں ایک بے نظیر انقلاب بپا کردیا کا استعمال کیا۔ (Islam and Evolution of Science, P, 15)۔

سائنس کی مختلف شاخوں پر ممتاز مسلم مصنفین

کی تحریر کردہ کچھ اہم کتابوں کا حوالہ دینا بے محل نہ ہوگا: الفارابی (ابو نصر محمد بن محمد ف ۳۳۹ھ) کی "احصاء العلوم"، چوتھی نصف صدی ہجری کی "رسائل اخوان الصفا و خلان الوفاء"، الخوارزمی (محمد بن احمد بن یوسف، ف ۳۸۷ھ) کی "مفاتیح العلوم"، ابن الندیم (محمد بن اسحاق، ف ۴۳۸ھ) کی "الفہرست"، ابن سینا (Avicenna)، (ف ۴۲۸ھ) کی "اقسام العلوم العقلیة"، ابن حزم (ف ۴۵۶ھ) کی "مراتب العلوم"، الابیون (ابوالمظفر محمد بن محمد ف ۵۰۷ھ) کی "طبقات العلوم"، ابن خلدون (ف ۸۰۸ھ) کی "المقدمة"، طاش کبری زادہ (ف ۹۶۸ھ) کی "مفتاح السعادة ومصباح السیادة فی موضوعات العلوم"، حاجی خلیفہ (ف ۱۰۶۷ھ) کی "کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون"، تھانوی (محمد بن علی ف بعد ۱۱۵۸ھ) کی "کشاف اصطلاحات العلوم" اور نواب صدیق حسن قنوجی (ف ۱۳۰۷ھ) کی "أبجد العلوم"۔ (Classification of Sciences in Islamic Thought Between Imitation and Originality, Page 8-9)

مسلمانوں کی کچھ سائنسی تصنیفات مغربی تعلیمی اداروں میں پوری پڑھائی گئیں جس نے یورپ میں سائنسی ترقی میں بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ابن سینا کی ''القانون''، ابن ہیثم کی ''کتاب المناظر'' اور الزہراوی کی ''کتاب التصریف'' بطور مثال قابل ذکر ہیں۔ ''کتاب القانون'' جو ایک جامع طبی تصنیف ہے اور جسے مغرب میں ''Canon'' کہا جاتا ہے کا ۱۲۷۰ء میں عبرانی زبان میں ترجمہ ہوا، دو مصنفین نے اس کا ترجمہ لاطینی میں بھی کیا اور یورپ میں اس کے تقریباً تیس ایڈیشن شائع ہوئے۔ پندرہویں صدی میں اس کی متعدد شروحات لکھی گئیں۔ اس تصنیف کا ایک خوبصورت عربی ایڈیشن روم میں ۱۵۹۳ء میں شائع ہوا۔ پندرہویں صدی کے نصف آخر میں یورپی یونیورسٹیوں کا نصف طبی نصاب اس میں شامل تھا اور Monpellier اور Louvain کی یونیورسٹیوں میں یہ ۱۹۵۰ء تک بطور ایک نصابی کتاب کے جاری رہی۔ کتاب کی پہلی جلد کا ترجمہ، بجز اس کے تشریحی حصہ کے، ۱۹۳۰ء میں انگریزی میں ہوا۔

''کتاب المناظر'' کا ترجمہ ''Opticae Thesaurus Alhazeni'' کے عنوان سے لاطینی میں کیا گیا۔ اس کتاب کے مصنف ابن الہیثم کو ''Alhazen'' کہا جاتا ہے، ایک ایسا نام جو یورپ میں آج تک یاد کیا جاتا ہے۔ جارج سارٹن ''George Sarton'' کے مطابق اس کتاب نے یورپی سائنسدانوں پر گہرا اثر ڈالا ہے (روجر بیکن ''Roger Bacon'' سے لے کر کیپلر ''Kepler'' تک یعنی تقریباً چھ سو سال)۔

کتاب التصریف بارہویں صدی کی طب اور جراحی سے متعلق ایک ہمہ گیر تصنیف ہے۔ کتاب التصریف کا ترجمہ کریمونا ''Cremona'' کے جیرارڈ ''Gerard'' نے لاطینی زبان میں کیا اور اس کے متعدد ایڈیشین وینس میں ۱۴۹۷ء میں اور بیسل میں ۱۵۴۱ء میں شائع ہوئے۔ یہ ۱۷۷۸ء میں آکسفورڈ میں اصل عربی متن کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس ایڈیشن کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں اور ایک باڈلین لائبریری میں موجود ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا، اور ایک فرانسیسی ترجمہ ۱۸۸۰ء میں ظہور پذیر ہوا۔ زہراوی کے اس شاہکار کی اہمیت صدیوں تک بطور جراحی کے دستور العمل کے سالیرنو ''Salernoa''، مانٹپیلیر ''Montpellier'' اور یورپ کے دوسرے شروعاتی اسکولوں میں قائم رہی۔ عظیم یورپی مؤرخین اعتراف کرتے ہیں کہ فن جراحی میں یورپ اپنی ابتدائی ترقی کے لئے زہراوی کا مقروض ہے۔ ڈاکٹر جوزف ہیریس ''Joseph Heres'' نے ابوالقاسم زہراوی کی شناخت بطور ایک ممتاز جراح کے کی ہے۔ ڈاکٹر ارنالڈ کیمپبل ''Arnold Campbell'' نے اپنی کتاب ''Arabian Medicine'' میں زہراوی پر ایک بڑا مقالہ تحریر کیا ہے جو مغرب میں اس نام کی اہمیت کا انکشاف کرتی ہے۔ انہوں نے عالم آشکارا کیا ہے کہ مغربی سائنسداں جیسے راجر بیکن (۱۲۱۴-۹۴ء) نے طب اور جراحی کا علم الزہراوی اور ابن رشد کی کتابوں سے حاصل کیا ہے۔

متعدد عربی الفاظ اور سائنسی اصطلاحات جو آج کل یورپی زبانوں میں مستعمل ہیں مسلمانوں کی جدید سائنس کے تئیں خدمات کی زندہ یادگاریں ہیں۔ علاوہ ازیں، ایشیا اور یورپ کی لائبریریوں میں کتابوں کی ایک بڑی تعداد، مختلف ملکوں کے عجائب خانوں میں محفوظ سائنسی آلات، صدیوں پیشتر تعمیر مساجد اور محلات بھی تاریخ عالم کے اس اہم مظہر کی واضح گواہی دیتی ہیں۔

آج کل کچھ یورپی زبانوں میں مستعمل کچھ عربی الفاظ اور اصطلاحات کا ذکر دلچسپ ہوگا۔ لاطینی، انگریزی اور فرانسیسی میں Ciphra،

Cypher اور Chiffre کی اصطلاحات عربی لفظ ''صفر'' سے مشتق ہے (جس کے معنی خالی یا عدم کے ہیں)۔ صفر ایک گنتی ہوتی ہے جو دوسری گنتی کے داہنی جانب لکھی جاتی ہے جس سے اس کی قیمت دس گنا بڑھ جاتی ہے۔ سترہویں صدی کے خاتمہ تک لفظ ''Chiffre'' کا استعمال فرانسیسی میں اسی مفہوم کے لیے ہوتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ یہ اعداد سے متعلق پورے موضوع یعنی علم الحساب کا نام پڑ گیا۔ انگریزی لفظ ''Cypher'' کا استعمال کسی خاص قسم کے صفر کے لیے ہوتا ہے''۔ (Islam And Evolution of Science, p. 17-19)

تعجب کی بات ہے کہ اس اصل حقیقت کے باوجود جب ہم لفظ سائنس سنتے ہیں تو ہمارا دھیان یقینی طور پر مغرب کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں: متعصب مؤرخین نے مسلمان سائنسدانوں کے بہت سے نام نظرانداز کر دیے ہیں، اگر ان میں سے کچھ کا تذکرہ کرتے بھی ہیں تو مسخ شدہ شکل میں، غیر مسلموں کی کیا بات کریں، پڑھے لکھے مسلمان بھی نہیں جانتے کہ بوعلی سینا، رازی اور جابر مسلمان تھے۔

ایسے کچھ نام درج ذیل ہیں:

	عربی نام	لاطینی نام
۱-	ابوالقاسم الزہراوی	Albucasis
۲-	محمد بن جابر بن سنان البطانی	Albetinius
۳-	ابوعلی بن سینا	Avicenna
۴-	محمد بن زکریا الرازی	Rhazes
۵-	ابن رشد	Averroes
۶-	ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی	Alkindus
۷-	ابوعلی بن الحسین بن الہیثم	Alhazen
۸-	عبدالعزیز بن عثمان بن القبیصی	Alcabitius
۹-	عبدالملک بن ابی العلاز ہر	Avenzoar

یہ مناسب وقت ہے کہ ہم مسلم سائنسدانوں کی خدمات اور ان کے کارناموں کو سامنے لائیں تاکہ ہماری نئی نسل ان کے کارنامے جان سکے اور سائنس کے ان پیشواؤں کی خدمات سے مستفید ہو سکے، یہ کتنی بدقسمتی کی بات ہے آج مسلمان تعلیم پر بہت کم توجہ دے رہے ہیں، جبکہ دوسرے لوگ ہمارے پیشرو سائنسدانوں کی خدمات اور کاموں سے مستفید ہو رہے ہیں، وقت کی یہ ضرورت ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دیں اور انہیں اچھی صفات اور عمدہ معیار سے متصف کریں تبھی ہماری گزشتہ شان دوبارہ لوٹ سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک نئے تمدن کی تشکیل کے لیے ہمیں اس پہلی وحی پر عمل کرنا ضروری ہے جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا تھا، ارشاد خداوندی ہے: ''اے محمد! اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے عالم کو پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے، اس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا''۔ [سورۃ العلق: ۵-۱]

☆☆☆☆☆

اوراقِ زندگی

(جلد اول)

ماضی کے جھروکوں سے کچھ تاریخی و خاندانی جھلکیاں۔ زندگی کے کچھ سبق آموز واقعات۔ مطالعاتی وتدریسی مشاغل، تعلیمی و دعوتی اسفار۔ اہم دینی، علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات سے ملاقاتیں۔ دینی، ملی، تعلیمی اور دعوتی تحریکات سے وابستگی کا حال۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

صفحات: ۵۰۴--- قیمت: ۴۰۰ر روپئے

ڈاک مصارف کے ساتھ صرف ۲۵۰ر روپئے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

ٹیگور مارگ، ندوہ کیمپس، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون نمبر: 0522-2741539 موبائل نمبر: 9889378176

ای میل: info@airp.org.in

حالات حاضرہ

کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

(بائیڈن کا دورۂ مشرق وسطی: حقائق اور مضمرات)

محمد فرمان ندوی

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

جولائی ۲۰۲۲ء کے وسط میں امریکی صدر جوزف بائیڈن نے مشرق وسطی کا چار روزہ دورہ کیا صدر کا یہ دورہ مشرق وسطی کا پہلا دورہ تھا، جب انہوں نے امریکہ کا صدارتی عہدہ سنبھالا ہے، تو وہ اس وقت سے اب تک اس خطہ میں نہیں آسکے چنانچہ وہ ۱۳-۱۷ جولائی ۲۰۲۲ء کو مشرق وسطی کے دورہ پر نکلے، ان کا پہلا پڑاؤ اسرائیل تھا، جہاں ان کا شایان شان استقبال ہوا، اس دورہ میں اسرائیل فلسطین، سعودی عرب اور اردن جیسے ممالک تھے، عالمی میڈیا میں اس دورہ کو اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا کہ یہ فیصلہ کن دورہ ہوگا، اور خوش کن نتائج لائے گا، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

بائیدن نے اپنے دورہ کے آغاز سے پہلے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ امریکہ مشرق وسطی کا حلیف و شراکت دار ہے، وہ اس کو ہرگز عالمی طاقتوں کی آماج گاہ بننے نہیں دے گا، تاکہ ان کا اثر ونفوذ اس خطہ میں ہو، امریکی صدر نے مزید کہا: ہم کسی حالت میں اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ چین، روس اور ایران کو اس علاقہ میں مؤثر کردار ادا کرنے دیں۔

فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے

متعدد تجزیہ نگاروں نے اس دورہ کے متعلق منفی تاثرات کا اظہار کیا ہے، اس دورہ کے مقاصد میں ایران کی جوہری ہتھیاروں پر قدغن لگانا تھا، اور یہ کہ سعودی عرب تیل کی پیداوار میں اضافہ کرے، تاکہ یوکرین پر روسی جارحیت کے نتیجہ میں امریکہ کو جن مسائل کا سامنا ہے، ان کو دور کیا جاسکے، مگر اس محاذ پر بھی صدر امریکہ کو کوئی کامیابی نہیں ملی، فلسطین اور اسرائیل کے سلسلہ میں ثالثی کا کردار ادا کرنے سے صدر بائیڈن گریزاں رہے۔ اگر وہ اپنے سیاسی حریف ڈونالڈ ٹرمپ کی پالیسیوں کے خلاف کوئی تجویز پیش کرتے تو فلسطینیوں کے حق میں بہتر ہوتا کیونکہ ٹرمپ نے صدی ڈیل، اور نہ معلوم کتنے غیر انسانی اقدامات کے ذریعہ فلسطینیوں کے اوپر کئے جانے والے ظلم میں اضافہ کیا ہے، بائیڈن کی شبیہ ایک سیکولر سیاست داں کی حیثیت سے امریکی انتخابات میں سامنے آئی تھی، اور اسی کو عنوان بنا کر ان کی پارٹی نے ان کو آگے بڑھایا، لیکن وہ بھی اپنی پرانی پالیسیوں کو نافذ نہ کرسکے، اور بقول اقبال (فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود میں ہے) کا ایک عملی ثبوت بھی فراہم ہوگیا۔

امریکہ کا صدر کوئی بھی ہو، جب بھی وہ خطہ فلسطین کا دورہ کرتا ہے تو اس سے خطہ والوں کو ایک آس قائم ہوتی ہے، یا ایک سراب نظر آتا ہے کہ مشرق وسطی میں مظلوم فلسطینیوں کے حقوق کی یازیابی ہوگی، اور ان کے سلب کردہ حقوق میں کچھ تخفیف ہوگی، لیکن جب دورہ کے نتائج اس کے برعکس ظاہر ہوتے ہیں تو جذبات کا خون ہوتا ہے، اور یہ دورہ آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مرادف قرار پاتا ہے، فلسطین کا مسئلہ ایک رستا ناسور کی حیثیت اختیار کرگیا ہے، ہر چند دنوں کے بعد فلسطینی عوام اسرائیلی تشدد کا نشانہ بنتے ہیں، ۴ / اگست ۲۰۲۲ء میں جاری اسرائیلی حملہ میں حماس قیادت کی کئی اعلی شخصیتیں شہید ہوئی، متعدد بار اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوششیں کی گئی، امریکہ بھی ثالثی بنا، لیکن مسئلہ حل ہونے کے بجائے الجھتا چلا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ فلسطینیوں کی سرزمین پر جب ایک دوسری قوم کو بسانے اور ان کی سرپرستی کرنے کا عمل ہوگا تو دشواری برقرار رہے گی۔ ضرورت تھی کہ سیاسی حیثیت رکھنے والے ممالک اس سلسلہ میں اقدامات کرتے اور مسئلہ کو انجام تک پہونچاتے، ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام فلسطینی سرزمین پر ہوا، اور ۱۹۶۷ء سے مسجد اقصی اور اس کے خطہ پر اسرائیل کا قبضہ ہے، وہ جب چاہتا ہے، اس کے اصل باشندوں کو اپنے حقوق اور فرائض کی بجاآوری سے روک دیتا ہے، اور ساری دنیا تماشائی بنی رہتی ہے، یا چند بیانات اور تجاویز اور ریزولیشن پاس کرکے خاموش ہوجاتی ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اسی دوران جب بائیڈن مشرق وسطی کا دورہ کررہے تھے روسی صدر ولا دیمیر پوتن، ترکی صدر اردگان اور ایرانی صدر ابراہیم رئیسی کی اعلی سطحی میٹنگ تہران میں ہورہی تھی، وہ یوکرین اور شام کی صورت حال پر غور وخوض کرنے کے لئے تھی، ۱۹ / جولائی کو یہ چوٹی کانفرنس ہوئی، اس میں پرامن طریقہ پر مسائل کو حل کرنے کی بات آئی، امریکی میگزین ''فارن پالیسی'' کے مطابق پوتن کے دورہ کو مشرق وسطی کے ممالک کو زیادہ حمایت ملی، کیونکہ اس خطہ کے ممالک اس بات کے لئے بالکل راضی نہیں کہ چین اور روس سے اپنے مفادات کو نقصان پہونچایا جائے، اب دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ حالات کیا رخ لیتے ہیں۔

ابراہیمی معاہدہ

بائیڈن کے اس چار روزہ دورہ کا مقصد ابراہیمی معاہدہ کو آگے بڑھانا تھا، ابراہیمی معاہدہ وہ پالیسی ہے جو ۱۳/اگست ۲۰۲۰ء کو ٹرمپ کے داماد کشنر کی قیادت میں تیار کی گئی اور اس کی تنفیذ عمل میں آئی، اس کے بعد کئی ممالک نے اسرائیل کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کئے، جن میں متحدہ عرب امارات، بحرین، سوڈان و غیرہ ہیں، گویا عالم عربی میں ابھی دیگر ممالک سے تعلقات کی استواری باقی ہے، اسی تناظر میں ایک ابراہیمی دین اور مذہب کی تشکیل کا عمل شروع کیا گیا ہے، یعنی یہودی، عیسائی اور اسلام کا ایک ملغوبہ تیار کیا جارہا ہے، اور اسلام کو خلط ملط کرنے کا ایکشن پلان بنایا جاچکا ہے، اس کا عنوان یہ دیا جارہا ہے کہ باہمی رواداری کو فروغ دینے کے لئے ہر مذہب کی بنیادی اور مرکزی تعلیم شامل کی جارہی ہے، لا حول ولا قوة الا باللہ۔

بلاشبہ مجوزہ دین ابراہیمی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کے ساتھ ایک کھلواڑ ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کو اس لئے استعمال کیا جارہا ہے، تاکہ ہر ایک کا اتفاق ہوسکے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسی متفق علیہ شخصیت ہیں، جن کو ہر مذہب کے پیروکار اپنا رہنما تسلیم کرتے ہیں، اور ان کی طرف نسبت کو اپنے لئے سرمایۂ فخر تصور کرتے ہیں۔ امریکی صدر نے اس موقع پر مجوزہ دین ابراہیمی کا حوالہ دیا، اور اس کو ایک راست مذہب قرار دیا، بلاشبہ یہ ایک سیاسی ہتھکنڈہ ہے، تاکہ اسرائیل کے لئے اس خطہ میں رہنے کا نہ صرف جواز فراہم ہو، بلکہ خطہ کے تمام ممالک اس سے اپنے سیاسی اور سفارتی روابط استوار کرلیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ امریکی صدر نے اپنے ایک انٹرویو میں یہاں تک کہہ دیا کہ مشرق وسطی کے لئے اصل خطرہ اسرائیل نہیں، بلکہ ایران ہے، اور اس نے ایران کے خلاف ایک عالمی محاذ قائم کرنے کا اعلان کیا ہے، اس اعلان کے مضمرات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس اعلان سے بائیڈن نے اسرائیلی جارحیت سے صرف نظر کرنے اور ایران کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے کا اشارہ دیا ہے، صدر کی منشا ہے کہ اسرائیل کو تحفظ فراہم ہو، اور وہ خطہ کا محافظ بنا رہے۔

تقریباً دو سال سے اسرائیل سے تعلقات کی بحالی کی بات بار بار دہرائی جارہی ہے، اور اس کو تسلیم کرنے کے لئے ذہن سازی کی جارہی ہے، بلکہ عرب ممالک پر سیاسی اور معاشی دباؤ بھی بنایا جارہا ہے، اسی تناظر میں کچھ ممالک نے پہل کی، اور اپنے آپ کو اسرائیل کی گود میں ڈال دیا، جبکہ اسرائیل کا خواب صرف ایک ملک تک محدود نہیں ہے، بلکہ نیل سے فرات تک پوری خطہ پر اپنا اثر قائم کرنا ہے، مشرق وسطی میں اسرائیل کے عزائم کو سمجھنے کے لئے صرف اس کے قومی ترانے کا ترجمہ پڑھ لینا کافی ہے ،جس کو ایک یہودی شاعر نفتالی ھیرتس نے ۱۸۸۶ء میں کہا تھا اور یہودی پارلیمنٹ نے اس کو ۲۰۰۴ء میں قومی ترانہ قرار دیا ہے، اصل ترانہ تو عبرانی زبان میں ہے، یہاں اس کا عربی وار دو ترجمہ نذر قارئین ہے:

طالما داخل القلب روح يهودية نابضة (اکثر بیشتر دل کے نہاں خانہ میں یہودی روح بیدار رہتی ہے)۔

فحنينها يميل الى الشرق وعينها ترنو الى صهيون (تو اس روح کا میلان مشرق وسطی کی طرف ہے، اور اس کی آنکھیں صہیونیت کو عملی شکل میں دیکھنا چاہتی ہیں)۔

أملنا لم يضع بعد، عمره ألفا سنة (ہماری توقع ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، اس تمنا کا حصول دو ہزار سال میں ممکن ہے)۔

أن نكون أمة حرة في وطننا، أرض صهيون و أورشليم (یہ کہ ہم اپنے وطن میں آزاد ہوں یعنی صہیون اور یورشلیم کی سرزمین پر)۔

یہودی شاعر کی یہ تمنا تقریبا ایک سو چالیس پہلے کی ہے، اور اسی فکر وسوچ پر تمام یہودیوں کی نشو ونما ہوتی ہے۔ فکری یلغار کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ یہودی پروٹوکول (۲) میں لکھا ہے کہ ہم نے ڈارون، کارل مارکس اور نٹشے کے نظریات سے لوگوں کو روشناس کرایا تاکہ لوگوں کو متنوع مسائل میں الجھایا جاسکے۔

این چہ بو العجبی است؟

بائیڈن اپنے اس دورے کی آخری پڑاؤ سعودی عرب پہونچے تو انہوں نے وہاں اٹھارے معاہدے کیے، جن میں ۱۳/معاہدے وژن ۲۰۳۰ سے متعلق ہیں، اور ان پر دستخط کیے، بائیڈن نے دبے الفاظ میں سہی جمال خاشقجی کا موضوع سعودی حکمرانوں کے سامنے پیش کیا، لیکن شیریں ابو عاقلہ جو ایک امریکی شہری تھیں، اور صحافت کے میدان میں ان کا نام تھا، اسرائیلی جارحیت میں وہ ماری دی گئیں ان پر صدر کی زبان تک نہیں کھلی، جن مسائل کو لے کر وہ بار بار اعلان کررہے تھے کہ ان سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی، آخر اس چار روزہ دورے میں کون سی رکاوٹیں پیش آگئی کہ ان پر گفتگو کرنا گوارا نہیں۔

یہ ایک سرسری جائزہ تھا، امریکی صدر کے مشرق وسطی کے چار روزہ دورے پر مرتب ہونے والے حقائق ومضمرات کا، بقیہ آئندہ دنوں میں حقائق سے پردہ اٹھے گا اور معلوم ہوگا کہ:

کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

☆☆☆☆☆

فقہ وفتاویٰ

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

سوال: ماہِ صفر کو بعض لوگ اپنے خیال میں منحوس سمجھتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہ مہینہ برکتوں سے خالی ہے اور اس مہینہ میں آسمان سے بلائیں اور آفتیں نازل ہوتی ہیں، اس لیے اس مہینہ میں کثرت سے تلاوت اور درود کا اہتمام کرنا چاہیے، ان کا ایسا کہنا اسلامی نقطۂ نظر سے کیسا ہے؟

جواب: اسلام میں کوئی وقت، کوئی دن یا کوئی مہینہ نامسعود و نامبارک نہیں، بلکہ ایسا کہنا زمانہ کو برا بھلا کہنا ہے، جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے: ”یؤذینی ابن آدم یسب الدھر و أنا الدھر بیدی الأمر،أقلّب اللیل والنھار“ [صحیح مسلم: ۴۴۵۲] لہٰذا ماہِ صفر کو منحوس خیال کرنا یا یہ کہنا کہ اس مہینہ میں آسمان سے بلائیں اور آفتیں نازل ہوتی ہیں، بے اصل اور اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے، ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان توہمات اور باطل نظریات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: ”عن أبی ھریرۃ قال :قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لاعدوی ولاطیرۃ ولاصفر ولاھامۃ“ البتہ قرآن مجید کی تلاوت اور درود شریف کا اہتمام اس مہینہ کے علاوہ بھی کثرت سے کرنا چاہیے۔

سوال: عام رواج یہ ہے کہ ولیمہ یا شادی کے موقع پر مہمان ایک لفافہ میں کچھ روپے رکھ کر میزبان کو دے جاتے ہیں اور مہمان اسے ایک ضروری رواجی عمل سمجھتے ہیں، کیا اس رسم کی اسلام میں کوئی اصل ہے؟

جواب: یہ کوئی شرعی عمل نہیں ہے، اگر کوئی شخص اس کو شرعی عمل سمجھے بغیر اور کسی سماجی اور اخلاقی دباؤ کے بغیر خوشدلی سے بطور ہدیہ کوئی رقم دے تو اس کی گنجائش ہے کیونکہ یہ شرعاً ہبہ ہے اور ہبہ کسی بھی شخص کو کسی بھی موقع پر اپنی رضامندی اور رغبت سے کیا جاسکتا ہے [البحر الرائق: ج۷/ص۴۸۳]، لیکن اگر سماجی دباؤ کے تحت لوگ اس کو لازم سمجھنے لگیں یا حکم شرعی کا درجہ دینے لگیں تو یہ صحیح نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ دعوت یا ولیمہ کے موقع پر اس طرح رقم پیش کی گئی ہو، اس لیے اس سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ اس قسم کا عمل آہستہ آہستہ سماج میں لازم اور واجب کا درجہ حاصل کرلیتا ہے جو درست نہیں۔

[مرقاۃ المفاتیح: ج۱/ص۳۳۶]

سوال: مہر کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے اور اس کی کم سے کم مقدار کیا ہے؟

جواب: مہر بیوی کا قرآن وسنت سے ثابت شدہ لازمی اور شرعی حق ہے اور اس کی ادائیگی شوہر پر واجب ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَة فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا“ [سورہ نساء: ۴۰/ ۷]۔

حدیث شریف میں مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم یعنی موجودہ اوزان کے مطابق ۳۲ گرام چاندی ہے اور زیادہ کی کوئی تعیین نہیں البتہ مہر کی مقدار میں مبالغہ سے کام لینا اور ناقابل ادائیگی مہر رکھنا شریعت میں محبوب نہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا: ”لوگو! مہر زیادہ نہ رکھا کرو، اگر زیادہ مہر رکھنا دنیا کی نگاہ میں عزت وشرافت اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک تقویٰ کی بات ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق تھے۔

[ترمذی، ابوداؤد]

معلوم ہوا کہ مہر زوجین کی مالی پوزیشن کی رعایت کرتے ہوئے اوسط درجہ کا ہونا چاہیے۔

سوال: ایک مرد وعورت کا آپس میں نکاح ہوا اور دونوں نے ایک ہی دن تنہائی میں گذارا، پھر طلاق کی نوبت آگئی تو ایسی صورت میں کتنا مہر واجب ہوگا، جب کہ میاں بیوی کے درمیان صرف تنہائی ہوئی، ازدواجی تعلقات قائم نہیں ہوئے ہیں؟

جواب: اگر میاں بیوی کے درمیان اتنی دیر کی تنہائی ہوئی جس میں ازدواجی تعلق قائم کیا جاسکتا تھا، اور کوئی رکاوٹ اس میں نہیں تھی تو مہر کے معاملہ میں یہ تنہائی صحبت کے حکم میں ہوگی اور کل مہر واجب ہوگا، قرآن مجید میں اس کا واضح حکم موجود ہے: ”لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ“. [سورہ بقرہ: ۲/۲۳۱]، وقال العلامۃ الکاسانی: المھر یتأکد بأحد معان ثلاثۃ: الدخول والخلوۃ الصحیحۃ وموت أحد الزوجین“.

[بدائع الصنائع: ج۲/ص۵۸۴]

☆☆☆☆☆

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

باسمہٖ تعالیٰ

تاریخ ۲۵؍اگست ۲۰۲۲ء

Date 25th August 2022

اپیل برائے تعمیر اسٹاف کوارٹرس

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ ناظم ندوۃ العلماء کی سرپرستی میں اپنی علمی ودینی خدمت میں مصروف ہے، دارالعلوم اور اس کی شاخوں میں علمی وتعلیمی امور حسب معمول جاری ہیں، اساتذہ وکارکنان ندوۃ العلماء اپنی ذمہ داریوں کو انجام دے رہے ہیں۔ اساتذہ واسٹاف کی کثرت کی وجہ سے دارالعلوم میں ان کی رہائش کی مزید گنجائش نہیں رہی تو احاطۂ دارالعلوم کے علاوہ معہد دارالعلوم ندوۃ العلماء (سکروری) میں اسٹاف کوارٹرس اور معہد سے قریب مستقل طور پر ندوہ کالونی کی سہ منزلہ عمارت تعمیر ہوئی، مگر اب بھی اسٹاف کے لیے کوارٹرس کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر ندوہ کیمپس سے متصل محلّہ مکارم نگر میں مزید اسٹاف کوارٹرس تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے بھروسہ پر یہ تعمیر شروع کرادی گئی ہے۔

جدید اسٹاف کوارٹرس کی زیر تعمیر یہ عمارت تین منزلہ ہوگی، جس میں ۹؍فیملی کوارٹرس ہوں گے، اس کی تعمیر پر مبلغ -/1,15,00,000 (ایک کروڑ، پندرہ لاکھ روپئے) کے خرچ کا تخمینہ ہے جو ان شاء اللہ اہل خیر حضرات کے تعاون سے پورا ہوگا۔

ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اس اہم ضرورت کی طرف فوری توجہ فرمائیں گے اور ندوۃ العلماء کے کارکنوں کا ہاتھ بٹائیں گے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ ہے کہ اس کی مدد سے یہ اہم کام تکمیل کو پہنچے گا، وما ذلك على الله بعزيز.

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(پروفیسر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) سید بلال عبدالحیٔ حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA
STATE BANK OF INDIA MAIN BRANCH, LUCKNOW
(IFSC CODE : SBIN0000125)

تعمیرات

A/c. No. 1086 3759 733

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA
اور اس پتہ پر ارسال کریں
NIZAMAT NADWATUL ULAMA
Nizamat Office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marg, Lukcnow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر
+91 - 7275265518
پر مطلع فرمانے زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔
فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا